تعلیم و تربیت
جون 2017
عید مبارک

77 واں سال دوسرا شمارہ

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

جون 2017ء

اس شمارے میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

چند ہندوستانی ملک ایران میں نمائش کے لیے ایک ہاتھی لے گئے اور اسے ایک تاریک گھر میں داخل کیا گیا۔ تا کہ اسے کوئی بے چراغ نہ دیکھے۔ چار شوقین رات کو ہاتھی دیکھنے آئے انہیں کہا گیا یہ دیکھنے کا وقت نہیں ہے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ہم ابھی دیکھیں گے اور بخدا دیکھ کر ٹلیں گے۔ ہمیں چراغ کی حاجت نہیں جو مانگو لے لو مگر ہاتھی ابھی دکھا دو۔ چناں چہ ان میں سے ایک ہاتھی کے قریب گیا اس کا ہاتھ اس کے سونڈ (خرطوم) سے جا لگا۔ وہ باہر آ کر کہنے لگا۔ ”ہاتھی نلکے کی طرح گول، مخروط اور لمبا ہے۔ دوسرا اندر گیا تو اس کا ہاتھ اس کی ٹانگوں پر پڑا وہ بولا۔ ”میں نے ہاتھی دیکھ لیا۔ ہاتھی ستون کی طرح ہے۔“ تیسرے نے اس کے کانوں کو چھوا اور کہا۔ ”ہاتھی تو پنکھے کی طرح ہے۔ ہاں کچھ چوڑا اور نرم سا ہے۔ چوتھے کا ہاتھ اس کی پشت پر پڑا تو وہ بولا۔ ”ہاتھی تخت کی مانند ہے۔

پیارے بچو! اگر ان کے ہاتھ میں شمع ہوتی تو ان میں اختلاف نہ ہوتا۔ دنیا داروں میں جو باہمی اختلاف ہے وہ جہالت کی تاریکی کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ نورِ علم سے مستفید ہوں تو نہ لڑیں نہ جھگڑیں۔

پیارے بچو اور عزیز ساتھیو! اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے اور یقیناً رمضان المبارک کی برکتوں سے فیض یاب ہو رہے ہوں گے۔ گرمی بھی شدید پڑ رہی ہو گی اور ساتھ آپ روزے بھی رکھیں گے تو گرمی سے بچنے کی تدابیر بھی اختیار کریں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں روزے، عبادات اور اسکول کے کام میں توازن رکھیں۔ جون کے آخر ہی میں آپ عید الفطر بھی منائیں گے۔ پیشگی مبارک باد قبول کیجیے۔ ایک گزارش آپ سے کرنی تھی کہ ”آپ بھی لکھیے“ میں کہانی بھیجتے وقت خیال رکھیں کہ آپ کی کہانی (ٹائپ شدہ) صفحے کا ڈیڑھ کالم ہونی چاہیے۔ پورا پتا اور موبائل نمبر ضرور لکھیں۔ علاوہ ازیں ”میری بیاض سے“ میں شعر کے ساتھ شاعر کا نام بھی ضرور لکھیں۔ شکریہ۔

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ”تعلیم و تربیت“ 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

ہیڈ آفس و شوروم: 81۔ ڈی/1، مین بلیوارڈ، گلبرگ، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔

UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816

E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com

tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 1000 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔

ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 35 روپے

حمدِ باری تعالیٰ

شفق میں تو دھنک رنگوں میں تو ہے
چمن زاروں میں تیرا رنگ و بو ہے
تو جھرنوں کی صداؤں میں چھپا ہے
تو یخ بستہ ہواؤں میں چھپا ہے
ہے اُونچے پربتوں میں ذات تیری
عبادت سب کریں دن رات تیری
پرندوں کی اُڑانوں سے ہے ظاہر
تو پتھریلی چٹانوں سے ہے ظاہر
تو ہے تحت الثریٰ تا عرشِ اعظم
نشانی ہیں تری یہ ماہ و انجم
عطا کرتا ہے سب کو زندگانی
تو پتھر سے نکالے ٹھنڈا — پانی
تو خالق اور مالک ہے ہمارا
مصیبت میں تجھے ہم نے پکارا

عرشِ اعظم: خدا کا تخت یا مقام
تحت الثریٰ: زمین کے سب سے نیچے کا طبقہ، پاتال
ماہ و انجم: چاند اور تارے
اُفتاد: مصیبت، پریشانی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

جہاں رہنا کمالِ زندگی ہے
وہی شہرِ رسولؐ ہاشمی ہے
وہاں تاریکیوں کا کیا گزر ہو
وہاں تو روشنی ہی روشنی ہے
درود پاک ہے جن کے لبوں پر
یقیناً ان کی بخشش ہو گئی ہے
بلاوا آئے گا انؐ کی طرف سے
مرے دل کی کلی کھلنے لگی ہے
کرم کی اک نظر ہم پر بھی آقاؐ
پریشانی ہمیں گھیرے کھڑی ہے
پریشان آپؐ کی اُمت ہے ساری
مرے آقا یہ کیسی بے بسی ہے
بُھلا بیٹھے ہیں شاید آپؐ کو ہم
تبھی اُفتاد یہ ہم پر پڑی ہے

ریاض حسین قمرؔ

روزہ کی حکمت

محمد طیب الیاس

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ "اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تا کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔" (البقرۃ، آیت: 183)

پیارے بچو! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے روزہ کی حکمت بیان فرمائی ہے: "تا کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔" تقویٰ کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ ہر قسم کے گناہوں سے بچا جائے۔ دراصل انسان کے ساتھ نفسانی خواہشات لگی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے انسان گناہوں پر آمادہ ہوتا ہے۔ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کی وجہ سے شہوات و لذات کی اُمنگیں ٹوٹ جاتی ہیں اور نفس کا میلان گناہوں کی طرف کم ہو جاتا ہے۔

رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھے جائیں، کھانے پینے وغیرہ کی خواہشات کو دبایا جائے تو انسان کے اندر ایک نکھار پیدا ہوتا ہے، اس کا باطن اُجلا اور ستھرا ہو جاتا ہے، نفس کی منہ زوری ٹوٹ جاتی ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "روزہ ڈھال ہے۔" (مسلم، کتاب الصیام: 1151)

مطلب یہ ہے کہ روزہ گناہوں سے اور جہنم کی آگ سے بچاتا ہے۔ اس لیے جو اہتمام سے روزے رکھتا ہے، قرآن و حدیث کے احکام و آداب کی مکمل اطاعت کرتا ہے تو اس کے لیے گناہوں سے محفوظ رہنا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ گناہوں سے بچنا روزہ کی حالت میں بھی ہو اور روزہ کے بعد بھی ہو، یعنی جھوٹ نہیں بولنا، کسی کی غیبت اور چغلی نہیں کرنی، کسی سے لڑنا جھگڑنا نہیں وغیرہ۔ اگر روزہ رکھے اور گناہ بھی ساتھ کرتا رہے تو وہ روزہ کے اعلیٰ و ارفع مقصد کو پانے والا نہ ہوگا اور روزہ کی برکات و ثمرات سے بھی محروم رہے گا۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹی بات اور غلط کام نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو کچھ حاجت نہیں کہ وہ (گناہوں کو چھوڑے بغیر) محض کھانا پینا چھوڑ دے۔" (بخاری، کتاب الصوم 1903)

اس حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ کھانا پینا چھوڑنے ہی سے روزہ کامل نہیں ہوتا بلکہ روزے کو ہر طرح کے گناہوں سے محفوظ رکھنا لازم ہے۔ روزہ منہ میں ہو اور آدمی بدکلامی کرے یہ بات اس کو زیب نہیں دیتی۔ اسی لیے ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "روزہ ڈھال ہے (یعنی گناہوں اور جہنم کی آگ سے بچاتا ہے) جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو گندی باتیں نہ کرے، شور نہ مچائے، اگر کوئی شخص گالی گلوچ یا لڑائی جھگڑا کرنے لگے (تو اس کو گالی یا تھپڑ سے جواب نہ دے) بلکہ یوں کہہ دے کہ میں روزہ دار آدمی ہوں (گالی گلوچ کرنا یا لڑائی لڑنا میرا کام نہیں)۔" (بخاری، کتاب الصوم 1904)

الحمدللہ رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کے علاوہ زیادہ سے زیادہ نیک کام کیے جائیں۔ نماز باجماعت ادا کی جائے۔ نوافل کا بھی خوب اہتمام ہوتا ہے۔ تراویح میں بھی شرکت کی جاتی ہے۔ تلاوت قرآن سے دلوں کو منور کیا جاتا ہے کیوں کہ رمضان تو ہے ہی قرآن کا مہینہ۔ اللہ کے راستے میں مال بھی خرچ کیا جاتا ہے کیوں کہ اللہ کے نبی کی سخاوت بھی رمضان کے مہینہ میں بڑھ جاتی تھی۔ ہمت اور توفیق مل جائے تو اعتکاف کی بھی سعادت حاصل کی جاتی ہے اور پھر رمضان کے آخری عشرہ میں طاق راتوں میں جاگ کر عبادت کی جاتی ہے۔

پیارے بچو! ان سب عبادات کی برکات کا حاصل ہونا، نیکی کے لیے اس کوشش اور جستجو کا کارگر ہونا تب ہی ہو گا جب ہم گناہوں سے بچیں گے اور بلا شبہ یہ گناہوں سے بچنا ہی روزہ کی روح اور حکمت ہے۔

☆☆☆

پرانے زمانے کی بات ہے، کوریا کے کسی گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ اس کی بیوی کب کی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ اولاد میں بھی صرف ایک لڑکی تھی، جس کا نام سن ہوا تھا۔ کسی زمانے میں کسان کے پاس کافی زمین تھی، جس میں وہ دھان اُگاتا تھا اور اس کی زندگی سکھ چین سے بسر ہو رہی تھی۔ مگر اب اس کے پاس ایک گز زمین بھی نہ تھی۔ وہ اور اس کی بیٹی دوسرے کسانوں کے کھیتوں میں کام کر کے پیٹ پالتے تھے۔

جب سن ہوا قسمت کا گلہ کرتی تو باپ ہنس کر کہتا۔ ''کیا ہوا جو میرے پاس زمین نہیں، ایک چھوٹا سا، خوب صورت سا گھر اور ایک ننھی سی، خوب صورت سی بیٹی تو ہے۔''

یہ سن کر سن ہوا زور سے قہقہہ لگاتی اور کہتی۔ ''گھر تو خیر خوب صورت ہے، لیکن میں خوب صورت ہرگز نہیں ہوں۔''

''تم خوب صورت بھی ہو اور عقل مند بھی۔'' باپ کہتا۔ ''اور جس باپ کو خدا نے ایسی بیٹی دی ہو، اسے اور کیا چاہیے؟''

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ کسان کی ڈاڑھی پہلے کھچڑی ہوئی (آدھی کالی، آدھی چٹی) اور پھر بالکل سفید ہو گئی۔ بتیسی بھی ساری جھڑ گئی۔ منہ پوپلا ہو گیا۔ کمر جھک کر کمان بن گئی۔ ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں اور اگر وہ لاٹھی کا سہارا نہ لیتا تو اوندھے منہ گر پڑتا۔ اب سارا کام کاج سن ہوا کرتی۔ باپ کھری کھٹیا (چارپائی) پر پڑا کھانستا رہتا۔ پھر بھی دال دلیہ چل ہی رہا تھا۔ دونوں باپ بیٹی کسی نہ کسی طرح پیٹ کا دوزخ بھر ہی لیتے تھے۔

جب کبھی بوڑھا بہت اُداس ہو جاتا اور اچھے دنوں کو یاد کر کے آنسو بہانے لگتا تو سن ہوا اسے تسلی دیتی۔ ''آپ دل میلا نہ کریں، ابا۔ میں اب زیادہ محنت کروں گی۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گی۔''

یہ کہہ کر وہ مسکراتی اور پھر کہتی۔ ''اور پھر ابا، آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہمارا اپنا گھر تو ہے، جس میں ہم آرام سے رہتے ہیں۔ در بدر کی ٹھوکریں تو نہیں کھاتے۔''

لیکن جلد ہی ان کی یہ خوشی بھی ملیامیٹ ہو گئی۔ ایک دن شام کو گورنر کے سپاہیوں نے سن ہوا کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور جب وہ باہر گئی تو اس سے کہا۔ ''تم نے کئی سال سے اپنے گھر کا ٹیکس نہیں دیا ہے۔ تین دن کے اندر اندر سارا ٹیکس ادا کر دو، ورنہ تمہارا گھر

نیلام کر دیا جائے گا۔''

سپاہیوں کے جانے کے بعد سن ہوا، گھر کے پچھواڑے، انناس کے درخت کے نیچے، سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور رو رو کر کہنے لگی۔ ''اف! میرے خدا! اب میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟''

''اپنی عقل استعمال کر!'' اچانک کسی کی آواز آئی۔

سن ہوا ایک دم تن کر بیٹھ گئی۔ اسے الفاظ صاف سنائی دیئے تھے، لیکن کہنے والا دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے درخت کے اوپر دیکھا، پھر دُور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ کی طرف نظر دوڑائی۔ لیکن اوپر نیچے، دائیں بائیں، کوئی بھی نہ تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ غیب کی آواز تھی۔ اس پر عمل کرنا چاہیے۔

دوسرے دن صبح کو، پو پھٹتے ہی، وہ گھر سے نکلی اور شہر کی طرف جانے والی سڑک پر ہولی۔ وہ شہر پہنچی تو چاروں طرف دھوپ پھیل چکی تھی۔ گورنر کے محل کے دروازے پر لمبے تڑنگے سپاہی پہرا دے رہے تھے۔ وہ دروازے میں داخل ہونے لگی تو ایک سپاہی نے کڑک کر کہا۔ ''اے لڑکی! کدھر جاتی ہے؟''

''گورنر صاحب کے پاس۔'' سن ہوا نے کہا۔

سپاہی اس کا مذاق اُڑانے لگے۔ لیکن ایک سپاہی کچھ نرم دل اور خدا ترس تھا۔ اس نے کہا۔ ''جانے دو بے چاری کو۔ دکھی لگتی ہے۔ فریاد کرنے آئی ہوگی۔''

سن ہوا آگے بڑھی۔ سامنے گورنر کا دفتر تھا۔ اس نے اپنے جوتے دفتر کے دروازے پر اُتارے اور ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئی۔ سامنے ایک بہت موٹا آدمی، ریشمی چوغہ پہنے، ایک بڑے سے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر گھنے سیاہ بالوں کا جوڑا بندھا تھا اور اس جوڑے میں ایک بہت قیمتی ہیرا جھل جھل چمک رہا تھا۔ اتنے ٹھاٹھ باٹھ کے باوجود اس کے چہرے پر نحوست برس رہی تھی۔ اس کے اردگرد بہت سے لوگ سر جھکائے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

گورنر سن ہوا کو دیکھ کر چونکا اور بولا۔ ''اے لڑکی! تو کون ہے، اور کیا چاہتی ہے؟''

سن ہوا نے ادب سے سر جھکایا اور بڑی میٹھی آواز میں بولی۔ ''میں ایک غریب کسان کی بیٹی ہوں اور حضور کو خوش کرنے آئی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ حضور خوش ہو کر میرے گھر کا ٹیکس معاف کر دیں گے۔''

گورنر اپنی توند پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''شکل سے تو تُو ایک احمق سی، بے وقوف سی، گنوار لڑکی دکھائی دیتی ہے۔ تو مجھے کس طرح خوش کرے گی؟''

''اپنی عقل سے، حضور، جو خدا نے مجھے بخشی ہے۔'' سن ہوا نے کہا۔

''ہو ہو ہو'' گورنر ہنس کر بولا۔ ''تجھے اپنی عقل پر بہت ناز ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہم تجھ سے تین سوال پوچھیں گے۔ تو نے ان کے صحیح جواب دے دیئے تو ہم تیرے گھر کا ٹیکس ہمیشہ کے لیے معاف کر دیں گے اور تجھے ایک ہزار اشرفیاں بھی انعام دیں گے۔ لیکن، اگر تیرے جواب غلط ہوئے تو؟''

''میں ایک کنیز کی طرح ساری زندگی حضور کی خدمت کروں گی۔'' سن ہوا نے جواب دیا۔

گورنر نے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''جب تو ہمارے محل میں داخل ہوئی تھی تو تُو نے دروازے پاس ایک تالاب دیکھا ہوگا، جس میں کنول کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ اب ہمارا سوال ذرا غور سے سن۔ اگر ہمارے سارے ملازم ایک ساتھ، ایک ہی وقت میں، اس تالاب کا سارا پانی پینا چاہیں تو کتنے پیالے درکار ہوں گے؟''

''صرف ایک پیالہ!'' سن ہوا نے مسکرا کر کہا۔

''صرف ایک پیالہ!'' گورنر حیرت سے اچھل پڑا۔

''صرف ایک پیالہ!'' گورنر کے ملازم بھی حیرت سے بڑبڑائے۔ ''یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟''

''بڑی آسانی سے'' سن ہوا بولی۔ ''آپ اتنا بڑا ایک پیالہ بنوائیں جتنا بڑا تالاب ہے۔ اس میں تالاب کا سارا پانی بھروائیں۔ آپ کے ملازم ایک ساتھ، ایک ہی وقت میں سارا پانی پی لیں گے۔''

''آہم، آہم، آہم'' گورنر کھسیانا ہو کر کھانسنے لگا۔ پھر اس نے کنکھیوں سے اپنے ملازموں کی طرف دیکھا جو لڑکی کی عقل مندی پر دل ہی دل میں اش اش کر رہے تھے۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' گورنر نے گلا صاف کر کے کہا۔ ''ہم مان لیتے ہیں کہ تمہارا جواب صحیح ہے۔ اب ہمارا دوسرا سوال سنو۔ سورج ایک دن میں کتنے میل چلتا ہے؟''

''ایک میل'' سن ہوا نے فوراً جواب دیا۔
''کیا؟'' گورنر نے تعجب سے کہا۔ ''تم یہ کس طرح کہتی ہو؟ کیا تم نے یہ فاصلہ ناپا ہے؟''
''حضور'' سن ہوا سر جھکا کر بولی ''وہ راستہ جو میرے گھر سے ان کھیتوں تک جاتا ہے جن میں میں کام کرتی ہوں، ایک میل لمبا ہے۔ جب میں صبح کو کھیتوں پر جانے کے لیے گھر سے نکلتی ہوں تو سورج میرے گھر کی چھت کے پیچھے سے نکل رہا ہوتا ہے، اور جب میں شام کو کھیتوں سے واپس آتی ہوں تو وہ کھیتوں کے پیچھے ڈوب رہا ہوتا ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ سورج ایک دن میں ایک میل چلتا ہے۔''
گورنر کے ملازم بے اختیار پکار اٹھے۔ ''واہ وا! شاباش! آفرین!'' لیکن جب گورنر نے انہیں گھور کر دیکھا تو خاموش ہو کر بغلیں جھانکنے لگے۔
''اچھا!'' کچھ دیر بعد گورنر بولا۔ ''تمہارا جواب صحیح ہے۔ اب تیسرا سوال سنو۔ اگر تم نے اس سوال کا جواب غلط دیا تو تم کل ہمارے باورچی خانے میں مسالا پیس رہی ہو گی...... یہ بتاؤ کہ ہمارے سر پر کتنے بال ہیں؟''
''ایک لاکھ پچیس ہزار۔'' سن ہوا بولی۔
''تمہیں کس طرح معلوم ہوا؟ کیا تم نے گنے ہیں؟'' گورنر نے پوچھا۔
''حضور، نائی کو بلا کر سر منڈوایئے اور پھر بال گن لیجیے۔'' یہ کہہ کر سن ہوا نے گورنر کی طرف دیکھا کہ دیکھوں یہ موٹا توندل اب کیا کہتا ہے۔
''یہ کیا بکواس ہے!'' گورنر چیخ کر بولا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ ہم اپنے نوکروں کے سامنے ٹنڈ کروائیں؟ یہ حسین، نرم و ملائم اور گھنے بال جو ہم نے سال ہا سال کی محنت سے پالے ہیں، منڈوا کر گنجے ہو جائیں، اور لوگوں کو اپنے اوپر ہنسوائیں؟''
''تو پھر اے حضور، یہ مان لیجئے کہ جو میں کہتی ہوں وہ سچ ہے۔'' سن ہوا بولی۔ ''کیوں کہ بغیر سر منڈوائے آپ یہ ثابت نہیں کر سکتے تھے کہ میرا جواب غلط ہے۔''
''لڑکی، ہم تمہاری عقل مندی اور حاضر جوابی سے بہت خوش ہوئے۔'' یہ کہہ کر گورنر نے اپنے ملازموں کو حکم دیا۔ ''اس لڑکی کو ایک ہزار اشرفیاں دے دو، اور جب تک یہ زندہ ہے، اس سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے۔''
سن ہوا اشرفیوں کی تھیلی بغل میں دبائے، خوشی سے جھومتی گھر واپس آئی تو اس کا باپ حیران پریشان بیٹھا آسمان کو گھور رہا تھا۔ بیٹی کو دیکھ کر اس کا جھریوں بھرا چہرہ چمک اٹھا۔ بولا۔ ''بیٹی، تو مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی؟''
''ابا جی، خدا نے ہمارے دن پھیر دیئے۔ اب ہم غریب اور کنگال نہیں رہے۔ یہ دیکھئے، سونے کی اشرفیاں۔ گورنر نے دی ہیں اور اس نے ہمارا ٹیکس بھی معاف کر دیا ہے۔'' سن ہوا نے چہک چہک کر باپ کو بتایا۔
''مگر میری گڑیا، میری چندا، میری لاڈلی، یہ سب کچھ کیسے ہوا؟'' باپ نے پوچھا۔
''یہ سب کچھ اس نے کیا۔'' سن ہوا نے دماغ پر انگلی رکھ کر کہا اور پھر شروع سے آخر تک ساری کہانی باپ کو کہہ سنائی۔

☆☆☆

پیٹو کی دعا

خداوند تو مجھ پر اس قدر اپنا کرم کر دے
کہ میرا پیٹ حلوے اور پوری سے کوئی بھر دے
ملیں کھانے کو مچھلی کوفتے بریانی جی بھر کر
کہیں سے میز پر آ جائیں تکے نان اور برگر
کھلائے مجھ کو سیبوں کا کوئی لا کے بھرا تھیلا
جنہیں کھاتے ہوئے ہوتا نہیں بندے کا دل میلا
کہیں سے آ جائیں انگور کیلے اور خربوز لے
ملیں آلو بخارے ناشپاتی اور تربوز لے
یہ ساری نعمتیں افراط سے مل جائیں کھانے کو
زمانہ دے دعائیں مجھ کو میں دوں گا زمانے کو
بھرے پیٹوں کسی ریڑھے پہ لد کے اپنے گھر جاؤں
نظر آئے کہیں زردہ پلاؤ جھٹ اتر جاؤں

محمد طاہر علی ضیاء، اسلام آباد

''احمد اگر تم نے اس شہر سے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گی اور بادشاہ کو سب سچ بتا دوں گی کہ احمد جھوٹا نجومی ہے پھر اس کے بعد وہ تمہیں جلاد کے حوالے کر دے گا جو تمہاری گردن اڑا دے گا۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو میں جو کہتی ہوں وہ کرتی ہوں۔ میرے الفاظ یاد رکھنا لہٰذا ہمت کرو اور قسمت آزمانے کی کوشش کرو تاکہ ہمیں بہت ساری دولت مل جائے۔''

اس کی بیوی نے اسے دھمکی دی تو احمد یہ سب باتیں سن کر چپکا ہو رہا کیوں کہ وہ اپنی ضدی بیوی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لہٰذا اس نے قسمت کے سامنے ہتھیار پھینک دیے اور بولا۔

''ٹھیک ہے جیسا تم کہتی ہو ویسا ہی ہوگا۔ میں اپنی زندگی کے یہ آخری چالیس دن اطمینان سے گزارنا چاہتا ہوں کیوں کہ اس کے بعد تو موت ہی ہے کیوں کہ میں کوئی نجومی تو ہوں نہیں جو حساب لگا کر خزانے کا پتا لگا لوں گا۔'' اس کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانے میں جا کر مرتبان سے کچھ بادام نکال لایا اور اپنی بیوی کو دیتے ہوئے بولا۔

''یہ چالیس بادام ہیں۔ تم اس میں سے ایک ہر رات کو عشاء کی نماز کے بعد مجھے دے دینا۔ میں ان باداموں کو ایک علیحدہ مرتبان میں رکھتا جاؤں گا۔ اس طرح گزرتے دنوں کی گنتی ہوتی رہے گی اور مجھے علم رہے گا کہ میری زندگی کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔'' احمد کی بیوی خوش اور مطمئن ہوگئی کہ احمد اب یہ شہر چھوڑ کر نہیں جائے گا لہٰذا اس نے احمد کی بات ماننے کا وعدہ کرلیا۔

اس دوران میں وہ چور جنھوں نے بادشاہ کا خزانہ چرایا تھا پکڑے جانے کے خوف سے ابھی یہ شہر چھوڑ کر بھاگے نہیں تھے۔ قریب ہی کے ایک کھنڈر میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کا ایک جاسوس ہر وقت بادشاہ کے دربار میں موجود رہتا تاکہ وہاں ہونے والی ہر خبر اور سرگرمی سے باخبر رہے۔ وہ جاسوس اپنے ساتھیوں کو پل پل کی خبر دیتا۔ اس دن بھی جب احمد کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اور احمد نے چالیس دن کی مہلت مانگی، ان کا وہی مخبر دربار میں موجود تھا۔ جب احمد نے چوروں کی تعداد چالیس بتائی تو وہ چونک گیا اور گھبرا کر بھاگتا ہوا سیدھا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور چیختے ہوئے کہنے لگا۔

''اب ہم سب پکڑے جائیں گے۔ ایک نیا نجومی جس کا نام احمد ہے وہ ہم سب کو پہچان اور جان گیا ہے۔ اس نے ہماری تعداد بھی بادشاہ کو بتا دی ہے۔''

اس کی یہ بات سن کر چوروں کا سردار ہنسنے لگا اور بولا۔ ''بادشاہ کے خزانے سے ہم نے سونے چاندی کے بھرے ہوئے چالیس مٹکے چرائے ہیں اس لیے کوئی بے وقوف بھی آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ کام چالیس چوروں کا ہے۔ اس کام کے لیے کسی نجومی کی ضرورت نہیں لیکن میں نے احمد نجومی کے بارے میں سنا ہے۔ آج کل بازار میں اس کی بہت شہرت ہے کیوں کہ اس نے چند اچھی پیشین گوئیاں کی ہیں اور لوگوں کے زیورات تلاش کر کے دیے ہیں اس لیے ہم اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے اس پر نظر رکھنا ہوگی۔ تم میں سے کوئی ایک شام کے بعد جب اندھیرا چھا جائے تو اس نجومی کے گھر میں جھانک کر دیکھے اور اس کی باتیں سننے کی کوشش کرے، وہ یقیناً اس چوری کے بارے میں اپنی بیوی سے باتیں کرے گا اور ہمیں بھی علم ہو جائے گا کہ وہ کتنا کامیاب ہو رہا ہے۔''

سارے چور سردار کی بات سن کر اثبات میں سر ہلانے لگے اور رات کا اندھیرا پھیلتے ہی عشاء کی نماز کے بعد ایک چور کو احمد کے گھر بھیجا گیا جو چھت پر چڑھ کر روشن دان کے ذریعے گھر کے اندر جھانکنے لگا۔ وہ وہاں اس وقت پہنچا جب احمد ابھی عشاء کی نماز سے فارغ ہوا ہی تھا اور اس کی بیوی نے اس کی ہدایت کے مطابق اسے ایک بادام دیا۔ بادام پکڑتے ہوئے احمد نے ایک آہ بھری اور حسرت بھرے لہجے میں بولا۔

''آج یہ ان چالیس میں سے پہلا ہے۔''

جب چور نے احمد کے یہ الفاظ سنے تو وہ گھبرا کر الٹے پاؤں واپس اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگا اور ان کو بتانے لگا کہ احمد نجومی کو اس کی موجودگی کا علم ہو گیا تھا اور اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ ان چالیس چوروں میں سے ایک آیا ہے۔ یقیناً اس بات کا پتا احمد نے اپنے علم سے لگایا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی بات کا یقین نہ کیا اور سردار نے فیصلہ کیا کہ کل رات ایک کی بجائے دو چور اکٹھے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ احمد کیا کر رہا ہے۔ چنانچہ اگلی رات دونوں چور اکٹھے اس کے گھر پہنچے۔ آج بھی احمد عشاء کی نماز سے فارغ ہوا ہی تھا، اس کی بیوی نے اس کی ہدایت کے مطابق اسے دو بادام لا کر دیے۔ احمد پھر بادام دیکھتے ہی بول اٹھا۔

''اوہ...... آج دوسرے کی باری ہے۔ اب تو دو اکٹھے ہو گئے ہیں۔''

دونوں چور اس کی بات سن کر حیران رہ گئے۔ وہ سمجھے احمد ان کے متعلق بات کر رہا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دونوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور سیدھے اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ کر ساری کہانی سنا دی کہ احمد نجومی نے آج اس بات کا بھی پتا لگا لیا کہ دو اکٹھے آئے ہیں۔ سردار نے ان کی بات کا یقین نہ کیا اور بولا۔

ارے بے وقوفو...... وہ نجومی ہے کوئی جادوگر نہیں جو تمہاری موجودگی جان لیتا ہے۔''

اس کے بعد سردار نے تیسری رات ان دونوں کے ساتھ تیسرا چور احمد کے گھر روانہ کیا۔ چوتھی رات چوتھا اور اسی طرح ہر رات ایک آدمی کا اضافہ کیا جاتا رہا۔ دن میں پکڑے جانے کے خوف سے وہ ہمیشہ رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد اس کے گھر آتے اور یہ وہ وقت ہوتا جب احمد عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوتا اور اس کی بیوی ستارہ اس کو ایک بادام لا کر دیتی۔ وہ ہر دفعہ بادام کی گنتی کرتا اور ان کی تعداد کو بلند آواز میں دہراتا اور چور سمجھتے کہ وہ ان کی تعداد جان گیا ہے اور ان کی موجودگی سے واقف ہو چکا ہے۔ چالیسویں رات وہ سب اکٹھے اس کے گھر پہنچے آج سردار بھی ان کے ساتھ تھا۔ احمد نے عشاء کی نماز ادا کی اور جب اس کی بیوی نے چالیسواں بادام لا کر اس کو دیا تو احمد بولا۔

''لو بھئی آج چالیس کی تعداد پوری ہو گئی۔ آج چالیس کے چالیس یہاں موجود ہیں۔''

چوروں کا سردار اس کی یہ بات سن کر پریشان ہو گیا اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ احمد ان کے متعلق جان چکا ہے اور کیسے اس نے ان کی درست تعداد معلوم کر لی ہے۔ سردار سوچنے لگا کہ احمد یقیناً بہت بڑا نجومی ہے۔ اس آدمی کو دھوکا دینا مشکل ہے۔ یہ ہر چیز جان لیتا ہے۔ وہ سب وہاں سے کھسکے اور اپنے ڈیرے پر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر سردار نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور سب نے یہ فیصلہ کیا کہ احمد سے کچھ چھپانا بہت مشکل ہے لہٰذا ہمیں اس کو سب سچ بتانا پڑے گا اور اس کو چوری کے مال سے کچھ رقم دے کر ساتھ ملا لیں گے۔

صبح سویرے فجر کی نماز کے فوراً بعد چوروں نے احمد کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ ابھی احمد فجر کی نماز سے فارغ ہی ہوا تھا اور

جائے نماز پر ہی بیٹھا اللہ سے اپنے بچاؤ کی دعا کر رہا تھا۔ دستک سنتے ہی احمد چونک گیا اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سمجھا کہ بادشاہ کے سپاہی آن پہنچے ہیں اور اب اس کو لے جا کر جلاد کے حوالے کر دیں گے جو اس کی گردن کاٹ کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دے گا کیوں کہ وہ بادشاہ کے خزانے کی چوری کا سراغ لگانے میں کام یاب نہیں ہو پایا ہے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے ہی وہ بلند آواز میں بولا۔

''رکو...... صبر کرو میں جانتا ہوں تم کون ہو اور کس غرض سے آئے ہو۔ یہ سخت بے انصافی ہے۔''

تمام چور اس کی بات سن کر مزید حیران ہو گئے۔ جب احمد نے گھر کا بیرونی دروازہ کھولا تو وہ اپنے سامنے شاہی سپاہیوں کی بجائے اجنبی نقاب پوش لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ احمد کو دیکھتے ہی سردار کہنے لگا۔

''اے عظیم نجومی......! تم سب جانتے ہو۔ تم دلوں کا حال جان لیتے ہو۔ تم نے یہ بھی جان لیا ہے کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ ہم یہاں اپنی صفائی دینے نہیں آئے کیوں کہ تم نے جان لیا ہے کہ ہم نے ہی بادشاہ کے خزانے میں چوری کی ہے اور اس کے ہیرے جواہرات سے بھرے چالیس مٹکے چرائے ہیں۔ ہماری طرف سے یہ سونے کی دو ہزار اشرفیوں سے بھری تھیلی قبول کرو اور ہمارے متعلق بادشاہ کو کچھ نہ بتاؤ۔''

احمد ان کی بات سن کر دنگ رہ گیا۔ وہ اپنی آنکھیں مسلنے لگا اور چٹکیاں کاٹ کاٹ کر اپنے آپ کو یقین دلانے لگا کہ وہ اس وقت سو نہیں رہا بلکہ جاگ رہا ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ جو کچھ وہ دیکھ اور سن رہا ہے یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے اور جو لوگ سامنے کھڑے ہیں وہ واقعی چور ہیں تو وہ بولا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں بادشاہ کو سچ نہ بتاؤں۔ یہ تو بے انصافی ہو گی اور پوری دنیا میں میری عزت نہیں رہے گی بلکہ بادشاہ کی طرف سے مجھے سزا بھی ملے گی لہٰذا میں کچھ نہیں چھپا سکتا اسے سب کچھ سچ بتا دوں گا۔''

اس کی بات سنتے ہی چوروں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل گر گئے اور گڑگڑا گڑگڑا کر کہنے لگے۔

''اے مہربان نجومی...... ہماری جان بخشی کر دو۔ ہم چوری شدہ سارا خزانہ واپس کر دیں گے۔''

ان کی بات سن کر احمد نے فوراً اپنا لہجہ بدل لیا اور تحکمانہ انداز میں کہنے لگا۔

''مجرمو...... اچھی طرح سمجھ لو اب تم میری گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ میری دسترس چاند اور سورج تک ہے۔ بارہ برج میری مٹھی میں ہیں اور میں ان کی ہر حرکت اور چال سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ میرا علم کہتا ہے کہ تمہارا یہ اعتراف جرم تمہیں بچا لے گا مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ تم فی الفور سب چوری شدہ خزانہ واپس کر دو۔''

''ہم اس کے لیے تیار ہیں مگر ہماری جان بچا لو۔'' سارے چور اس کے سامنے فریاد کرنے لگے۔

احمد نے کچھ سوچا پھر بولا۔ ''فوراً جاؤ اور جو چالیس مٹکے تم نے بادشاہ کے خزانے سے چرائے ہیں ان کو لے جا کر بادشاہ کے محل کے پیچھے جو پرانا متروک کنواں ہے اس کی جنوبی دیوار کے ساتھ ایک فٹ گہرا گڑھا کھود کر اس میں دبا دو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہاری جان بچ سکتی ہے لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا یا اس میں کچھ بھی فرق رکھا تو تم پر اور تم سب کے خاندانوں پر آسمان سے بلائیں نازل ہوں گی، قہر ٹوٹے گا اور تم سب بھسم ہو جاؤ گے۔ یہ سب آسمانوں پر تمہارے ستاروں میں لکھا ہے۔'' احمد نے ان سب کو بُری طرح ڈرا دیا۔

چور گھبرا کر فوراً واپس ہو لیے اور انہوں نے احمد سے وعدہ کیا کہ جیسا اس نے کہا ہے وہ ویسا ہی کریں گے۔ ان کے جاتے ہی احمد فوراً سجدے میں گر گیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے ایک دفعہ پھر اس کی جان بچانے کا سبب پیدا کر دیا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد شاہی سپاہی آن پہنچے اور احمد کو اپنے ساتھ شاہی دربار میں چلنے کا حکم دیا۔ احمد نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی بیوی سے رخصت لے کر اور اس کو مل کر تھوڑی ہی دیر بعد دربار میں پہنچتا ہے۔ دراصل اس طرح احمد کچھ وقت لینا چاہتا تھا کہ چور اس کے کہنے کے مطابق اپنا کام مکمل کر لیں اور خزانے کے مٹکے محل کے پیچھے اندھے کنوئیں کے قریب دفن کر دیں۔ اس کی بیوی بھی بہت خوش تھی کہ اب احمد کو بادشاہ سے بہت ساری دولت ملے گی اور وہ لوگوں کو اپنی دولت دکھا کر ان کو جلائے گی۔

اپنے وعدے کے مطابق احمد جب بادشاہ کے دربار میں پہنچا تو

وہ پوری طرح پر اعتماد تھا۔ بادشاہ بے صبری سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی کہنے لگا۔ ''آج وعدے کے چالیس روز پورے ہو گئے ہیں احمد...... کیا تم میرے خزانے کی چوری کا سراغ لگانے میں کام یاب ہوئے ہو۔''

''عالم پناہ......! پہلے یہ وضاحت فرمایئے کہ آپ کو زیادہ کس چیز کی ضرورت ہے۔ چوروں کی گرفتاری کی یا اپنے خزانے کی واپسی کی۔'' احمد نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا تو بادشاہ حیران رہ گیا اور کہنے لگا۔

''نجومی تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بادشاہ سلامت یہ سوال اس لیے پوچھا ہے کہ میرا ستاروں کا علم بتاتا ہے کہ آپ کو ان دونوں میں سے ایک چیز ملے گی۔ وہ جس کا آپ انتخاب کریں گے۔ دونوں ایک ساتھ ممکن نہیں۔'' احمد نے جواب دیا تو بادشاہ بولا۔

''مجھے افسوس ہو گا اگر میں چوروں کو سزا نہ دے سکا لیکن اگر معاملہ انتخاب کا ہے تو میں یقیناً اپنا خزانہ واپس چاہوں گا، وہ میرے لیے زیادہ اہم ہے۔''

''کیا آپ چوروں کو معاف کر دیں گے اور ان کو سزا نہیں دیں گے۔'' احمد نے پوچھا۔

''اگر مجھے میرا سارا خزانہ واپس مل جائے تو میں انہیں معاف کر دوں گا۔'' بادشاہ نے جواب دیا۔

''تو پھر اگر عالم پناہ آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں تو میں خزانے کے اس مقام کی نشان دہی کر سکتا ہوں جہاں چوروں نے خزانہ چھپا رکھا ہے۔'' احمد نے جواب دیا۔ اس کے بعد احمد اپنے ساتھ بادشاہ اور تمام درباریوں کو لے کر شاہی محل کے عقب میں اندھے کنوئیں کے قریب پہنچ گیا۔ کنوئیں سے تھوڑی دُور وہ رک گیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا اور اپنی انگلی کی مدد سے آسمان پر کچھ فرضی اشارے اور شکلیں بنانے لگا۔ اس کے بعد وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگا۔ بادشاہ اور دوسرے لوگوں نے سمجھا کہ وہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے یا ستاروں کا کچھ حساب لگا رہا ہے۔ مگر درحقیقت احمد اپنی جان بچنے پر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ جب اس کی وہ دعا ختم ہوئی تو اس نے کنوئیں کی جنوبی دیوار کی طرف اپنی انگلی کی مدد سے اشارہ کیا اور بادشاہ سے کہنے لگا۔

''بادشاہ سلامت! سپاہیوں اور غلاموں کو حکم دیجیے کہ وہ اس جگہ کھدائی کریں۔''

بادشاہ کے حکم پر کھدائی کا کام فوراً شروع ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں زمین کے اندر سے سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے بھرے چالیس مٹکے برآمد ہو گئے۔ ان کے منہ پر شاہی مہر لگی ہوئی تھی اور ان میں سے کچھ بھی کم نہ تھا۔ خزانے کو صحیح سلامت دیکھ کر بادشاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے خوشی سے بے قابو ہو کر احمد کو گلے لگا لیا اور اسی وقت اس کو اپنا شاہی نجومی مقرر کرنے کا اعلان کرتے ہوئے ایک عالی شان محل دینے کا اعلان بھی کیا قسمت پوری طرح احمد پر مہربان تھی۔ احمد کو فوراً اپنی بیوی ستارہ کا لالچی پن یاد آ گیا جس کی وجہ سے وہ کئی بار مرتے مرتے بچا اور اس مشکل میں پھنسا۔

احمد کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی اس کی کام یابی اور شاہی

نجومی مقرر ہونے کی اطلاع اس کے گھر پہنچ گئی۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے خوشی خوشی اس کا استقبال کیا۔ آج وہ بہت خوش تھی پہلے کی طرح منہ بسورے نہیں پڑی تھی۔ وہ احمد کو دیکھتے ہی کہنے لگی۔

''دیکھا احمد میری بات ماننے کا نتیجہ۔ آج تم شاہی نجومی بھی بن گئے ہو اور تمہارے پاس بہت دولت بھی آ گئی ہے۔''

''ہاں یہ سب تمہاری وجہ سے ہی ہے۔ یہ تمہاری بات ماننے کا نتیجہ ہی ہے کہ میں کئی بار موت کے منہ میں پہنچا۔ اگر اللہ کی مدد نہ ہوتی تو میں شاید کبھی بچ نہ پاتا۔ تمہارے لالچ نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تم نے ہمیشہ مجھے گھر سے نکالنے کی دھمکی دے کر اپنی بات منوائی مگر اب مجھے بادشاہ نے ایک محل دے دیا ہے۔ میں اپنا سامان لے کر وہاں جا رہا ہوں۔ تم رہو اسی گھر میں...... میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا کیوں کہ تم بہت لالچی ہو۔''

اس کی یہ بات سن کر ستارہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور وہ رو رو کر احمد کی منت سماجت کرنے لگی کہ وہ اسے چھوڑ کر نہ جائے۔ کوئی چارہ نہ پا کر اس نے لالچ سے توبہ کرنے اور ہمیشہ احمد کی بات ماننے کا وعدہ کیا تو احمد نے اسے معاف کر دیا اور دونوں میاں بیوی اسی شام اپنے عالی شان نئے محل میں منتقل ہو گئے۔

قسمت کا پہیہ پوری طرح گھوم چکا تھا۔ صبح تک وہ ایک غریب موچی تھا مگر اب شام کو وہ ایک عالی شان محل کا مالک اور شاہی نجومی بن چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کا مزاج نہ بدلا اور وہ ویسا ہی عاجز، خدا کا شکر ادا کرنے والا اور منکسر المزاج تھا۔ ساری رات وہ سوچتا رہا۔ صبح ہوتے ہی وہ شاہی دربار میں پہنچا اور بادشاہ سے کہنے لگا۔

''بادشاہ سلامت......! رات میں نے اپنے ستاروں کا حساب لگایا تو مجھے علم ہوا ہے کہ اب مجھے نجومی کا کام چھوڑ کر کوئی اور کام اختیار کر لینا چاہیے ورنہ میری زندگی کو کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔''

بادشاہ نے اس کی بات سن کر مزید کچھ کہے اس کو شاہی نجومی کے عہدے سے ہٹا کر شاہی خزانچی کا عہدہ دے دیا۔ جس کو پا کر احمد مطمئن ہو گیا کیوں کہ اب وہ مزید کسی کو دھوکا دینا نہیں چاہتا تھا اب تک اس نے جو کیا تھا وہ اپنی لالچی بیوی کے کہنے پر کیا تھا اب وہ توبہ کرنا چاہتا تھا۔ اللہ نے اس کو دولت اور عزت دے دی تھی اس لیے اب وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے مطمئن زندگی گزارنے لگا۔

☆☆☆

بقیہ: ٹلہ جوگیاں

کہا جاتا ہے اسی دور میں رانجھا بھی یہاں آیا تھا، یہی وہ بالناتھ جوگی ہے جسے سکھ کے مذہبی پیشوا بابا گورونانک بھی بالناتھ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔

ٹلہ جوگیاں کے استھان کے بارے میں ہندو عقائد کے مطابق کئی ایک کرامات مشہور ہیں لیکن علاقے میں جو کرامت زیادہ مشہور ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ کئی سالوں تک علاقے میں بارش نہ ہوئی جس وجہ سے خشک سالی ہو گئی۔ تالاب نالے سب خشک ہو گئے۔ علاقے کے لوگوں نے کلاناتھ جوگی سے درخواست کی کہ وہ بارش کے لیے دعا کریں۔ وہ جوگی ٹلہ کے نیچے دامن میں پہنچے۔ وہاں پیر دادو حقانی کی درگاہ کے کنوئیں سے پانی نکالا اور گھڑے میں ڈال کر سر پر اُٹھا کر چڑھائی چڑھنا شروع کر دی ابھی وہ آدھے راستے میں ہی تھے کہ سیاہ بادل چھائے اور بارش شروع ہو گئی اور علاقے سے خشک سالی کا خاتمہ ہوا۔

یہ کرامت تو ہندو جوگی کی ہے۔ وہاں مسلمان درویش بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ ٹلہ کے صدر دروازے کے ساتھ ہی ایک مسلمان درویش کی یادگار بنی ہوئی ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک بار کسی درویش کا ٹاکرہ جوگی کے ساتھ ہوا۔ مسلمان درویش نے جنگلی زیتون کی شاخ کو مویشیوں کے باندھنے کی جگہ پر گاڑ دیا اور بآواز بلند کہا ''جب تک کلہ تب تک ٹلہ آدھا ئکا اور آدھا گلہ'' یعنی جب تک زیتون کی شاخ زمین میں گڑی رہے گی، اس وقت تک ٹلہ بھی قائم رہے گا اور نصف خشک اور نصف ہرا بھرا رہے گا۔ آج بھی یہ کرامت دیکھنے کو ملتی ہے کہ جنگلی زیتون کے جنگل کا سایہ ٹلہ کی ڈیوڑھی پر چھاؤں کیے ہوئے ہے اور آدھا حصہ بالکل خشک ہے۔

آج محکمہ سیاحت کے بروشرز پر ٹلہ جوگیاں تو ہے مگر وہاں کی خستہ حالی پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ اگر اب بھی اس قدیم ورثہ کی دیکھ بھال کے لیے اقدامات نہ کیے گئے تو آنے والے وقتوں میں اس کے کھنڈرات بھی نہیں ملیں گے۔ یہ کام حکومت اور آثار قدیمہ کا ہے کہ وہ اس ورثے کو محفوظ کرے۔

☆☆☆

شہزادے سے مزدور تک

محمد صدیق قیوم

عباسی خلیفہ مامون الرشید کا صاحب زادہ علی بن مامون ایک روز قصر شاہی کی چھت سے بلند برجوں سے بغداد کے بازار کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ ناز و نعم میں پلا بڑھا تھا، اس کی سواری پُر سکون اور نرم و گداز تھی۔ اس کی زندگی لطف و آرام میں کٹ رہی تھی۔ وہ قیمتی اور خوب صورت لباس تن زیب کرتا۔ علی اپنے محل کی چھت سے بازار کے اندر لوگوں کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔ یہ جا رہا ہے، یہ بیچ رہا ہے، وہ خرید رہا ہے۔ غرض ہر ایک اپنے اپنے کام میں منہمک و مشغول ہے۔ شہزادے نے اپنی نظر ایک آدمی پر جمائی جو اجرت پر بار برداری کا کام کر رہا تھا، اس کے چہرے پر تقویٰ و پرہیز گاری کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے کندھوں پر رسیاں لٹک رہی تھیں۔ وہ سامان اپنی پیٹھ پر لاد کر ایک دکان سے دوسری اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر رہا تھا۔ شہزادہ علی اس محنت و مشقت کرنے والے بار بردار (قلی) کی حرکت و سکنات کا بغور معائنہ کر رہا تھا۔ جب چاشت کا وقت ہوا تو وہ قلی اپنا کام چھوڑ کر بازار سے نکل گیا اور دجلہ کے ساحل کو چلا گیا۔ وہاں سے دجلہ کے پانی سے وضو کیا۔ دو رکعت نماز پڑھی اور اپنے ہاتھ اٹھا کر اللہ کے دربار میں دعائیں کرنے لگا۔ جب قلی نے دعا کر لی تو پھر اپنے کام پر واپس ہو لیا اور مسلسل محنت و لگن کے ساتھ ظہر سے کچھ وقت پہلے تک اپنے کام میں مشغول رہا پھر ایک درہم میں خشک روٹی خریدی اور اسے لے کر دریائے دجلہ کے کنارے چلا گیا۔ جہاں اس نے پانی میں روٹی بھگوئی، کھا کر پانی پیا اور اللہ کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر نماز ظہر کے لیے وضو کیا، نماز پڑھ کر بیٹھ گیا اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں پھر اپنے پروردگار سے سرگوشی کرنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔ اسی طرح پھر عصر کی نماز ادا کی۔ دن بھر انتہائی محنت و مشقت سے اپنا کام کیا اور جب شام ہوئی تو کچھ سامان خرید کر گھر واپس چلا گیا۔ دوسرے دن وہ پھر بازار آیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اسی طرح اس نے تیسرے اور چوتھے دن بھی وہی کیا اور اس معمول کے مطابق اپنی زندگی گزارتا رہا۔ شہزادہ علی اس قلی کو دیکھ کر بڑے تعجب میں پڑ گیا اور اس کے حالات سے واقفیت کا شوق اس کے دل میں سما گیا۔ چناں چہ کچھ دنوں بعد اس نے قلی کو بلوانے کے لیے اپنا ایک فوجی بھیجا۔ وہ فوجی گیا اور قلی سے کہا کہ شہزادہ صاحب آپ کو قصر شاہی میں یاد فرما رہے ہیں۔ قلی نے جواب دیا کہ مجھ میں اور بنو عباس کے بادشاہوں میں کیا واسطہ؟ میرے اور ان کے خلفاء کے درمیان کوئی رشتہ داری بھی نہیں نہ مجھے کسی قسم کی کوئی دشواری ہے اور نہ مجھے کوئی اہم معاملہ درپیش ہے۔ اگر کوئی مشکل گھڑی آ پہنچتی ہے تو میں اس ہستی کی طرف رجوع کرتا ہوں جو زندہ ہے اور زمین و آسمان سب اس کے قائم کردہ ہیں۔ جب میں بھوکا ہوتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے آسودہ کرتا ہے اور جب میں پیاسا ہوتا ہوں تو مجھے اللہ تعالیٰ سیراب کرتا ہے۔ میرے پاس نہ تو کوئی جائیداد ہے نہ اپنا گھر اور نہ زمین۔ فوجی نے کہا، ''یہ امیر کا حکم ہے اس لیے آج تجھے ہر صورت میں شہزادے کے محل میں حاضری دینا پڑے گی۔'' قلی نے سمجھا کہ امیر اس کا محاسبہ کرے گا یا اس کے خلاف کوئی حکم صادر کرے گا چناں چہ اس نے کہا: ''حسبنا اللہ ونعم الوکیل، اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ بہت اچھا کار ساز ہے۔'' قلی امیر المومنین مامون رشید کے صاحب زادے علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا۔ شہزادہ علی: ''کیا تو مجھے نہیں پہچانتا؟'' قلی: ''میں کبھی آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا جب میں نے آپ کو دیکھا ہی نہیں تو پہچان کیسے سکتا ہوں؟''

شہزادہ علی: ''میں خلیفہ کا صاحب زادہ ہوں۔'' قلی: ''لوگ بھی

یہی بتا رہے تھے۔'' ''شہزادہ علی تمہارا کام کیا ہے؟'' قلی: ''میں اللہ کے ملک میں اللہ کے بندوں کے ساتھ کام کرتا ہوں۔'' شہزادہ علی: ''میں نے تجھے کافی دنوں سے مشقت کے کام کرتے دیکھا۔ اس لیے میری خواہش ہوئی کہ میں تمہارا بوجھ ہلکا کر دوں۔'' قلی، ''وہ کیسے؟'' شہزادہ علی: ''تم اپنے اہل و عیال کے ساتھ آجاؤ اور ہمارے قصر میں رہائش اختیار کرو۔ کھاؤ پیو آرام کرو، کوئی رنج نہ ہو گا اور نہ کام کاج کے بارے میں کچھ فکر کرنی پڑے گی۔'' قلی: ''شہزادہ صاحب! رنج تو اسے نہیں ہوتا جو گناہ کے کاموں میں ملوث نہیں ہوتا۔ غم سے وہ بچا ہوا ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کے کاموں سے خود کو الگ تھلگ رکھتا ہے اور جو کوئی برائی نہیں کرتا اس کو فکر کس بات کی؟ البتہ جو آدمی اللہ کے غیظ و غضب اور اس کی نافرمانی میں اپنی صبح و شام گزارتا ہے۔ وہی رنج و غم اور فکر سے دو چار ہوتا ہے۔'' شہزادہ علی: ''تمہارے گھر والے ہیں؟'' قلی: ''میری ماں ہے جو نہایت ہی بوڑھی ہے۔ میری ایک ہمشیرہ ہے جو اندھی ہے۔ وہ دونوں ہر روز روزے سے رہتی ہیں۔ میں روزانہ مغرب سے پہلے ان دونوں کے لیے افطار کا بندوبست کر کے لاتا ہوں۔ ہم سب مل کر افطار کرتے ہیں اور عشاء کی نماز کے بعد سو جاتے ہیں۔'' شہزادہ علی: ''پھر تم جاگتے کب ہو؟''

قلی: ''جب اللہ تعالیٰ آسمان سے دنیا پر رات کے تیسرے حصے میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔'' شہزادہ علی: ''کیا تیرے اوپر کسی قسم کا قرض ہے؟''

قلی: ''گناہوں کا بوجھ ہے جو میرے اور میرے اللہ کے درمیان ہے۔'' شہزادہ علی: ''کیا تو نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ شاہی قصر میں رہے؟'' قلی: ''اللہ کی قسم نہیں۔'' شہزادہ علی: ''آخر کیوں؟'' قلی: ''مجھے سختی دل اور دین کے ضیاع کا خوف ہے۔''

شہزادہ علی: ''کیا تجھے یہ منظور ہے کہ تو بھوکا قلی بنا رہے اور تیرے جسم پر کپڑے بھی پورے نہ ہوں اور یہ منظور نہیں کہ تو میرے ساتھ رہے؟'' قلی: ''یہی بات ہے اللہ کی قسم۔'' پھر قلی شہزادہ علی کے پاس سے واپس ہو گیا۔ قلی کے جواب سے شہزادہ بڑا متاثر ہوا۔ ایک رات شہزادہ اپنی غفلت سے ہوش میں آیا اور چیختے ہوئے نیند سے بیدار ہوا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اب تک گہری نیند سو رہا تھا۔ اب توبہ کر کے اللہ کا مخلص بندہ بن جانا چاہیے۔ چناں چہ شہزادہ علی اپنے ملازم سے کہنے لگا: ''میں دُور دراز علاقے میں جا رہا ہوں۔ جب تین دن کا وقفہ گزر جائے تو میرے والد کو بتا دینا کہ میں کوچ کر چکا ہوں۔ اب میرے اور میرے والد کی ملاقات قیامت ہی کے روز ہو گی۔''

یوں شہزادہ علی رات کے اندھیرے میں قصر شاہی سے نکلا۔ اپنی شان دار قباء کو پھینک دیا اور فقراء و مساکین کا لباس پہن کر راتوں رات نکل پڑا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ شہزادہ علی واسط (ایک شہر کا نام) کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے اپنی ہیت تبدیل کر لی اور مسکین وفقیر بن گیا۔ اس نے اینٹ بنانے والے ایک تاجر کے ساتھ بحیثیت مزدور کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ اینٹ اور مٹی ڈھونے اور مکانات بنانے کا کام کرتا۔ یوں خلیفہ کا بیٹا اپنے محل کو چھوڑ کر اب غریبوں کی سی زندگی گزارنے لگا۔ وہ روزے رکھتا، رات کو دیر تک اللہ کی عبادت کرتا، صبح و شام مناجات میں لگا رہتا۔ قرآن کریم حفظ کرتا اور اللہ سے لو لگائے رکھتا۔ اس کے پاس صرف ایک ہی دن کی خوراک ہوتی۔ چناں چہ اب اس کے رنج و غم اور کرب و پریشانی سب غائب ہو گئے اور اس کا کبر و غرور اور گھمنڈ سب ختم ہو گیا۔ جب شہزادے کی موت کا وقت آن پہنچا تو اس نے اس تاجر کو اپنی اصلیت سے آگاہ کیا کہ وہ مامون الرشید کا بیٹا ہے۔ نیز اس نے وصیت کی کہ مرنے کے بعد اس کو غسل دے کر دفن کر دیا جائے پھر اپنی انگوٹھی نکال کر تاجر کو دی کہ وفات کے بعد یہ انگوٹھی خلیفہ مامون کے حوالے کر دے۔ چناں چہ جب شہزادے کا انتقال ہو گیا تو تاجر نے اسے نہلا دھلا کر کفن پہنایا اور اس کی نماز جنازہ پڑھ کر اسے دفن کر دیا۔ اس کے بعد انگوٹھی لے کر خلیفہ مامون کی خدمت میں پہنچا۔ جب خلیفہ کی نگاہ اپنے صاحب زادے کی انگوٹھی پر پڑی تو اس قدر رویا کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ پھر خلیفہ مامون نے تاجر سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیا کرتا تھا؟ تاجر نے خلیفہ کو بتایا کہ شہزادہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کثرت سے کرتا تھا۔ زہد و ورع (پرہیز گاری) اس کی خاص صفت تھی۔ وہ اللہ کی طرف زیادہ سے زیادہ رجوع کرتا اور اللہ کے ذکر و اذکار میں اس کے اوقات گزرتے تھے۔ یہ بیان کرنے کے بعد تاجر نے خلیفہ کو بتایا کہ اب اس کا بیٹا اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ یوں محلات کے ایک شہزادے نے گمنامی کی زندگی گزارنا قبول کیا مگر اللہ کے ہاں سرخرو ہو گیا۔ ان شاء اللہ۔

☆☆☆

دنیا میں سب سے بڑا .... معلوماتِ عامہ

محمد فرحان اشرف، ہارون آباد

☆ دنیا میں سب سے بڑا انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا بحیرہ جنوبی چین ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا اعزاز نوبیل انعام ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا براعظم بلحاظ آبادی ایشیا ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا براعظم بلحاظ رقبہ ایشیا ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا بند سنکروڈ ٹیلنگ، کینیڈا ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک بلحاظ آبادی انڈونیشیا ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک بلحاظ رقبہ قازقستان ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا بحری جنگی جہاز یو ایس ایس میسوری ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا اسلامی اعزاز شاہ فیصل بین الاقوامی ایوارڈ ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا بینک، بینک آف ٹوکیو، کینیڈا ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا خشکی کا پرندہ شتر مرغ ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا سمندری پرندہ الباطروس ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا دریا (طاس) ایمزون ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا پہاڑی سلسلہ اینڈز جنوبی امریکہ ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا تیل کا ٹینک آرامکو، سعودی عرب ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا تیل کا علاقہ غوار، سعودی عرب ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا خشکی کا جانور ہاتھی ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا جزیرہ گرین لینڈ ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا مونگے کا جزیرہ کواجلین، مارشل آئی لینڈ ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا جزیرہ نما، جزیرہ نمائے عرب ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا اسلامی رہنما کا جنازہ جمال عبدالناصر کا تھا۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا جنگل شمالی روس میں صنوبر کا جنگل ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا جنگی جہاز یاماٹو، جاپان ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا چڑیا گھر ایتوشا قومی پارک نمیبیا ہے۔
☆ دنیا میں سب سے بڑا درخت جنرل شرمن، کیلیفورنیا امریکہ ہے۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/جون 2017ء ہے۔

کھون لگائیے

نام: ____________
شہر: ____________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/جون 2017ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ____________
مقام: ____________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

جون کا موضوع "عید کا دن" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08/جون 2017ء ہے۔

ہونہار مصور

نام: ____________ عمر ____________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________
مقاصد ____________
موبائل نمبر: ____________

م	ٹ	ع	ی	گ	ش	ا	ر	غ	پ
ہ	ا	ش	د	ا	ب	ل	د	س	ن
ا	ن	ظ	م	س	ص	ڈ	ا	ء	ح
ع	ا	ل	ج	ت	ظ	ث	غ	ژ	ذ
و	ط	ا	ے	ا	گ	م	ل	ک	ظ
ا	ل	م	ذ	ر	ت	م	و	ک	ح
م	س	و	ن	ے	ش	ل	گ	چ	ش
پ	م	ر	ع	ڈ	آ	س	م	ا	ن
ز	و	ب	ر	ت	ز	ء	ص	ض	ف
ز	ٹ	ن	س	ل	ط	ن	ت	ل	ے

آپ نے حروف ملا کر دس چیزوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

ستارے، آسمان، تربوز، سلطان، بادشاہ، ملک، سلطنت، حکومت، عوام، رومال

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن پاک کی ایک سورۃ یورپ کے ایک شہر کے نام پر ہے۔ نام بتائیے۔

i۔ قرطبہ   ii۔ روم   iii۔ وینس

2۔ قسطنطنیہ کا موجودہ نام ہے:

i۔ وینس   ii۔ اشبیلیہ   iii۔ ترکی

3۔ بادشاہی مسجد کا مکمل رقبہ کتنا ہے؟

i۔25876 مربع گز   ii۔25877 مربع گز   iii۔25878 مربع

4۔ گندھک اور شورے کا تیزاب کس نے ایجاد کیا؟

i۔ بوعلی سینا   ii۔ زکریا رازی   iii۔ جابر بن حیان

5۔ یہ شعر بانگ درا سے لیا گیا ہے، مکمل کیجیے:

میں بُلبلِ نالاں ہوں اِک اُجڑے گلستاں کا ....

6۔ رضیہ سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی تھی، رضیہ سلطان نے کون سا لقب اختیار کیا تھا؟

i۔ سلطان شمس الدین   ii۔ سلطان جمال الدین   iii۔ سلطان جلال الدین

7۔ حضرت علیؓ کی تحریر کردہ شہرۂ آفاق کتاب کا نام بتائیے؟

i۔ نہج البلاغہ   ii۔ فصوص الحکم   iii۔ قصص الانبیا

8۔ وہ کون سا عنصر ہے جو ہیرے میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے؟

i۔ میگما   ii۔ کاربن   iii۔ نائٹرک ایسڈ

9۔ پاکستان میں پہلی مردم شماری کب ہوئی تھی؟

i۔1950ء   ii۔1951ء   iii۔1952ء

10۔ سائیکلوں کا شہر چین کے کس شہر کو کہا جاتا ہے؟

i۔ شن یانگ   ii۔ بیجنگ   iii۔ شنگھائی

جوابات علمی آزمائش مئی 2017ء

1- دورفترت   2- کرین   3- ترکی
4- صحرا کا چمن   5-1799ء   6- شیخ سعدی شیرازی
7- مگرمچھ   8- پھلیاں   9- نیلا
10- پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جارہے ہیں۔

☆ محمد یحییٰ خان، فیصل آباد (150 روپے کی کتب)
☆ صدیق الرحمن، سرگودھا (100 روپے کی کتب)
☆ عون اللہ ورک، لاہور (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: محسن کبریا، سرائے عالم گیر۔ مریم ملک ذوالفقار علی، طیبہ ملک ذوالفقار علی، گوجرانوالہ۔ حازق شاہد، موسیٰ اکبر، اسوہ بلوچ، غازی عبداللہ، اسلام آباد۔ محمد سلطان عبداللہ، چشتیاں۔ مبشرہ عمر، جواد احمد فراز، انوشہ فاطمہ، مائرہ شاہد، کشف مریم، سیدہ زہرہ فاطمہ، مناہل عدیل، ردا عدیل، ارمش مبشر، عائشہ نور، فائقہ عمر، لاہور۔ ماہ نور اختر، محمد فرقان جمال، گل فاطمہ، راول پنڈی۔ سعدہ معصومہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ہادیہ خالق، ڈیرہ غازی خان۔ فیضان فراز خان، مردان۔ زوہیب مظہر، طوبیٰ صدیقی، جڑانوالہ۔ عزیز رائے، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ حلیمہ حسین گجر، کوٹ سلطان۔ صدف آسیہ، محمد اسد، عروبہ امین، کراچی۔ راج ولی خان، نوشہرہ۔ ابو ہریرہ، شیخوپورہ۔ محمد ابوبکر اشرف آرائیں، کبیر والا۔ شیخ نفع احسان محصی، ملتان۔ حافظ وقاص رؤف، صادق آباد۔ مقدس خان، حیدر آباد۔ رائقہ، حذیفہ اظہر، مطیع اللہ بلوچ، عبداللہ نذیر، فیصل آباد۔ آمنہ شاہد، مبشرہ فاطمہ، سیال کوٹ۔ حسن رضا سردار وصفی، خدیجہ نشان، نفیسہ فاطمہ قادری، عائشہ فاطمہ، نور حسین قادری، محمد اسد عبداللہ قادری، محمد عبدالمجید قادری، کاموکی۔

شباب کا آغاز ہوا تو آپؓ شریفانہ مشغلوں میں مشغول رہے۔ پہلوانی اور کشتی میں کمال حاصل کیا۔ شہ سواری میں بھی طاق تھے۔ اس زمانے میں پڑھنا لکھنا سیکھا جب تمام قبیلے میں صرف 17 آدمی تھے جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ فکر معاش میں مشغول ہوئے تو تجارت شروع کی۔ 27 ویں سال میں آخری نبیؐ پر ایمان لائے۔ 13 ہجری میں خلیفہ بنے تو رعایا کی خبر گیری کرتے۔ رات کو ایک دفعہ گشت پر نکلے۔ مدینہ سے تین میل پر صرار نامی ایک مقام پر پہنچے۔ دیکھا تو ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں پاس جا کر حقیقت حال دریافت کی تو اس عورت نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا۔ ان کے بہلانے کے لیے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چڑھا دی ہے۔ آپؓ فوراً اٹھے۔ مدینہ میں آ کر بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں اور اپنے غلام سے کہا کہ میری پیٹھ پر رکھ دو۔ غلام نے کہا کہ میں لیے چلتا ہوں۔ فرمایا کہ ''ہاں لیکن قیامت کے روز تم میرا بار (بوجھ) نہیں اٹھاؤ گے۔'' غرض سارا سامان لا کر اس عورت کو دیا۔ اس نے آٹا گوندھا، ہانڈی چڑھائی۔ آپؓ نے خود چولہا پھونکا، کھانا تیار ہوا تو بچوں نے سیر ہو کر (پیٹ بھر کر) کھایا۔ آپؓ بہت خوش ہوئے۔ عورت نے کہا: ''خدا تم کو جزائے خیر دے، سچ یہ ہے کہ امیر المومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ کہ.........'' پیارے بچو! غور سے پڑھ بتائیے کہ ان جلیل القدر ہستی کا نام مبارک کیا ہے؟؟

پیارے بچو! مئی 2017ء کے کھوج لگائیے کا جواب ہے: روسٹر Rooster یعنی مرغا انڈے نہیں دیتا۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے پانچ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

1۔ شاہدہ جبین، گوجرانوالہ
2۔ ابو ہریرہ، شیخوپورہ
3۔ عروبہ امین، کراچی
4۔ مائرہ شاہد، لاہور
5۔ جواد احمد فراز، لاہور

عیرہ بلا خوف وخطر آگے بڑھی۔

''کاکروچ کو دیکھو تو شور مچانے کی بجائے اسے مار ڈالو، بھلا کیسے......؟ ایسے......!'' ایک پٹاخ کی آواز سے کاکروچ زمین پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ کچن کے ایک کونے میں فاطمہ باجی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ عیرہ کاکروچ کو مارنے کے بعد ہنستے ہوئے فاطمہ باجی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فاطمہ باجی کی چیخ وپکار سن کر عیرہ کی امی بھی بھاگتے ہوئے کچن میں پہنچیں تو کاکروچ کو مرے دیکھ کر سارا ماجرا ان کی سمجھ میں آ گیا کہ فاطمہ کی چیخ وپکار کیوں تھی۔

''عیرہ تو میری شیر پتر ہے۔ فاطمہ تم تو بدھو ہی رہنا۔'' عیرہ کا ہمیشہ کی طرح بہادرانہ کارنامہ دیکھ کر امی جان عیرہ کی بلائیں لینے لگیں۔ عیرہ کی تعریف کرتے ہوئے امی جان نے اس بات کا خیال رکھا کہ وہ عیرہ سے دور ہی رہے کیوں کہ وہ بھی فاطمہ باجی کی طرح کاکروچ سے اتنی ہی خوف زدہ ہوتیں تھیں بلکہ تھوڑا زیادہ کہہ لیا جائے تو بھی اس میں حرج نہیں۔ امی جان کو تعریف کرتے دیکھ کر عیرہ نے ایک نظر فاطمہ باجی پر ڈالی اور ہنستے ہوئے کچن سے باہر نکل گئی۔ اتنی دیر میں بازار سے مہد بھی انرجی سیور لے آیا تھا۔

''مہد! شام ہونے کو ہے اور ابھی کھانا بھی بنانا ہے، اس لیے جلدی سے انرجی سیور لگا بھی دو۔''

''امی! مگر...... میں کیسے لگاؤں۔''

''جیسے آپ کے ابو انرجی سیور لگا لیتے ہیں۔''

''ابو! ابو جان تو بڑے ہیں نا......'' ماں بیٹے کی تکرار جاری تھی کہ دونوں کی تکرار سن کر عیرہ بولی۔

''مہد! تم بچے ہی رہنا، بھلا اس میں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہ لیں! امی آپ کی لاڈلی جالینوس بھی آ گئی ہیں۔'' مہد نے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

''جالینوس کے کچھ لگتے، ادھر دو مجھے سیور، اور مجھ سے سیکھو کیسے لگاتے ہیں یہ انرجی سیور۔'' عیرہ نے مہد کے ہاتھ سے انرجی سیور اُچک لیا۔ مہد کو حکم دیا کہ جاؤ صحن میں جو دو سٹول پڑے ہیں وہ مجھے لا کر دو، عیرہ نے دونوں سٹول اوپر نیچے رکھے، جنہیں مہد نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا، سٹول پر چڑھتے ہوئے عیرہ نے احتیاط کا دامن تھامے رکھا اور انرجی سیور انرجی سیور والے پلگ میں لگا دیا۔

☆☆☆

اختر چوہدری صاحب کی بڑی بیٹی فاطمہ، عیرہ کا دوسرا نمبر جب کہ مہد ان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ عیرہ بچپن سے ہی غیر معمولی بچی

واقع ہوئی تھی۔ جب پہلے دن اسکول گئی تو واپسی پر ایک نئے کارنامے کے قصے رات کے کھانے کی میز پر سنائے جا رہے تھے۔ اسکول کے پہلے دن ہوا کچھ یوں کہ عبیرہ کے ساتھ ڈیسک پر بیٹھی ایک لڑکی بانو نے اس وقت شور مچا دیا جب اس نے کاپی نکالنے کے لیے اسکول بیگ کی زیپ کھولی تو کاپی کے ساتھ ایک چھپکلی بھی اس کے ڈیسک پر آن گری۔ بانو کا شور کیا تھا ایک واویلا تھا، پوری کلاس بانو کا شور سن کر جب اس کی طرف متوجہ ہوئی تو سامنے ڈیسک پر چھپکلی دیکھ کر بجائے بانو کو چپ کراتے ٹیچر سمیت پوری کلاس، کلاس روم سے باہر کھڑی تھی۔ ایک عبیرہ تھی جو کلاس روم میں کھڑی چھپکلی کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب عبیرہ نے دیکھا کہ چھپکلی بالکل ساکت پڑی ہے تو وہ آگے بڑھی اور غور سے دیکھنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ یہ تو پلاسٹک کی چھپکلی ہے، وہ پلاسٹک کی چھپکلی کو دُم سے پکڑ کر کلاس روم سے باہر نکلی تو پوری کلاس کی دوڑیں دیکھنے والی تھیں۔ پرنسپل کے روم میں جا کر معمہ حل ہوا کہ کسی بچے نے شرارت سے بانو کے بیگ میں کھلونا چھپکلی رکھ دی تھی۔ کھانے کی میز پر نہ صرف اختر چوہدری صاحب چھپکلی والا قصہ سن کر ہنس رہے تھے بلکہ رضوانہ بیگم عبیرہ کی امی جان، فاطمہ، مہد اور عبیرہ کی خالہ اقرا اور ان کی بیٹی افرا جب کہ چاچا شکیل بھی ہنس رہے تھے اور عبیرہ کی بہادری پر اسے داد دے رہے تھے۔

عبیرہ کی انہی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے عبیرہ کو گھر میں غیر معمولی پذیرائی بھی ملتی تھی۔ خصوصاً اس کے ابو جان اختر چوہدری ہمیشہ اس کی ہر خواہش کو فوراً پورا کرتے تھے۔ اس دن جب اس نے فرمائش کی کہ وہ جوڈو کراٹے سیکھنے کے لیے کلب جانا چاہتی ہے تو ابو جان نے فوراً ہامی بھر لی۔ اب تو ماشا اللہ عبیرہ جوڈو کراٹے میں بھی بلیک بیلٹ تھی۔ عبیرہ کے ساتھ ساتھ مہد اور افرا نے بھی جوڈو کراٹے سیکھنے شروع کیے تھے۔ لیکن یہ دونوں ابھی بلیک بیلٹ تک نہیں پہنچے تھے۔ عبیرہ، افرا اور مہد کی خوب بنتی تھی۔ ایک تو تینوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے، دوسرا تینوں اکٹھے مل کر ہوم ورک کرتے اور تیسرا ان کے شوق بھی ایک جیسے تھے۔ ایک دن عبیرہ نے رائے دی کہ کیوں نہ ہم اپنا ایک گروپ بنائیں اور ایک نام بھی رکھیں۔ مہد، عبیرہ کی بات سن کر جھٹ سے بولا۔

''تھری اسٹار گروپ۔''

''نہیں!'' افرا کا سر انکار میں ہلا۔ تینوں سر جوڑ کر اپنے گروپ کا نام سوچنے لگے۔

''مشن اسکواڈ......! یہ نام بھی ہو سکتا ہے۔'' مہد ایک بار پھر بولا۔

''ہو نہیں سکتا بلکہ ہمارے گروپ کا یہی نام ہو گا۔'' عبیرہ اور افرا کے منہ سے ایک دم نکلا۔ تینوں نے ہاتھوں پر ہاتھ مارے اور وکٹری کا نشان بنانے لگے۔

اس طرح انہوں نے اپنے گروپ کو ایک نام ''مشن اسکواڈ'' میں سمو دیا۔ تینوں کی رائے اور عبیرہ کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے عبیرہ کو مشن اسکواڈ کا لیڈر نامزد کیا گیا کہ اگلے ایک سال عبیرہ کی کارکردگی کو جانچا جائے گا۔ اگر عبیرہ نے اچھی کارکردگی دکھائی تو مشن اسکواڈ کی لیڈر یہ ہی رہیں گی۔ ورنہ مشورے سے کسی دوسرے کو اسکواڈ کا لیڈر نامزد کیا جائے گا۔

تو پیارے بچو! اب پڑھیے مشن اسکواڈ کا پہلا کارنامہ۔ اور دیکھیے کہ کیسے باہمت بچیوں اور بچوں نے معاشرتی برائیوں کا خاتمہ کرنے میں مدد دی۔

☆☆☆

عبیرہ اور افرا چلتے چلتے رک گئیں تھیں۔

گلی کی نکڑ پر ہی بخاری صاحب دودھ والے سے اس بات پر جھگڑا کر رہے تھے کہ گذشتہ کئی دنوں سے دودھ میں پانی زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے دودھ گاڑھا نہیں ہوتا۔ بس آج اپنا حساب چلتا کرو اور ہم نیا دودھ والا لگوا لیں گے۔ اسکول جاتے ہوئے عبیرہ اور افرا اس لیے رکی تھیں کہ کل رات ہی عبیرہ کی امی بھی دودھ والے کا گلہ کر رہی تھیں کہ بارہا شکایت کرنے کے باوجود دودھ والے پر اثر نہیں ہوا اور دودھ دن بدن پتلا ہونے لگا ہے۔ عبیرہ کی امی اس کے ابو جان سے کہہ رہی تھیں کہ کیوں نہ دودھ والا ہی بدل لیا جائے۔ ابو جان نے بھی امی کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

دودھ والا جو نزدیکی گاؤں سے آتا تھا۔ پورا محلہ اسی دودھ والے سے دودھ لیتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس کا دودھ گاڑھا ہوتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی دودھ میں پانی ملانے لگا۔ جس کی وجہ سے دودھ پتلا ہونے لگا۔ پچھلے دنوں گھر میں ابو جان کے مہمان آئے ہوئے تھے۔ امی جان نے چائے بنا کر ڈرائنگ روم میں بھیجی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد ابو

جان غصے میں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ چائے کا بالکل ذائقہ نہیں تھا۔ بے ذائقہ چائے کی وجہ سے انہیں مہمانوں کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑی۔ وہ امی جان پر برس رہے تھے۔ امی جان نے اس دن بھی دودھ کا رونا رویا کہ اس میں بھلا ان کا کیا قصور۔ قصور تو دودھ والے کا ہے جو روزانہ شکایت کے باوجود دودھ پتلا دے کر جا رہا ہے۔ اس پتلے دودھ سے چائے بھی بے ذائقہ ہی بنتی ہے۔

اسکول سے چھٹی کے بعد جب عبیرہ گھر پہنچی تو اس نے اپنی امی کو بتایا کہ آج صبح وہ نکڑ والے بخاری صاحب دودھ والے سے دودھ پتلا ہونے کی وجہ سے جھگڑا کر رہے تھے۔

''ہم نے بھی آج اس دودھ والے کو جواب دے دیا ہے۔ بلکہ اس کے دودھ کا حساب بھی چکتا کر دیا ہے۔'' امی نے ایک نئی خبر دی۔

''اس کا مطلب اب نیا دودھ والا ڈھونڈا جائے گا۔'' عبیرہ نے جھٹ سے پوچھا۔

''ڈھونڈا کہاں ہے، وہ بھی مل گیا۔ آج دوپہر میں پتا چلا کہ پورے محلے نے ہی آج دودھ والے کا حساب چکتا کر دیا ہے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے بخاری صاحب کا، ان کے ایک جاننے والے تھے جو نزدیکی گاؤں خیر پور سادات سے دودھ دینے شہر میں آتے ہیں۔ بخاری صاحب کے توسط سے اب وہ دودھ والا اس محلے میں بھی دودھ دیا کرے گا۔'' امی نے دوسری خبر دی۔

''اس کا مطلب اب دودھ گاڑھا ملا کرے گا۔ پھر اسے کاڑھنے کے بعد جب اس پر بالائی آئے گی تو وہ میں کھاؤں گی۔'' عبیرہ نے زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہاں نہ صرف میری گڑیا بالائی کھائے گی بلکہ ہم نے تو ایک کلو دودھ اضافی بھی لگوا لیا ہے۔ سوچا خالص دودھ ہوگا تو اس کا دہی بنا کر مکھن نکالا کریں گے۔ مکھن بھی تو میری گڑیا رانی کو اچھا لگتا ہے نا...... ! چلو شاباش یونی فارم تبدیل کرو، کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔ پھر اٹھ کر ہوم ورک بھی کرنا ہوگا۔'' امی نے پچکارتے ہوئے عبیرہ کو کہا۔ عبیرہ حسب معمول یونی فارم تبدیل کر کے ہاتھ منہ دھونے کے بعد کھانا کھا کر کمرے میں لیٹ گئی اور خواب خرگوش کے مزے لینے لگی۔

محلے میں اب خیر پور سادات گاؤں کا دودھ والا ہی دودھ دینے آنے لگا تھا۔ اس کا دودھ واقعی خالص اور گاڑھا تھا۔ دودھ گرم کرنے کے بعد اس پر بالائی کی موٹی تہہ جم جاتی۔ امی اتنی موٹی بالائی کی تہہ دیکھ کر کہتی تھیں کہ جب امی جان کے گھر گاؤں میں اپنی بھینسیں ہوتی تھیں تو بھی اتنی موٹی بالائی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن یہ دودھ تو کچھ زیادہ ہی خالص لگتا ہے۔ محلے والے خوش تھے اور بخاری صاحب کو دعائیں بھی دیتے تھے۔

☆☆☆

عبیرہ اور افرا دونوں کہنے کو خالہ زاد بہنیں تھیں لیکن دونوں کی دوستی بھی اپنی مثال آپ تھی۔ دونوں اپنے اسکول کی ہونہار طالبات تھیں۔ اسکول میں چاہے تقریری مقابلہ ہو یا ڈرائنگ، پی ٹی شو یا کوئز مقابلے دونوں کی جوڑی بہت مقبول تھی۔ اسکول میں ان کے بہت سے کارنامے بھی بہت مشہور تھے۔ جیسے ایک بار انہوں نے لنچ چور پکڑے تھے۔ جو طالبات کے بیگوں سے لنچ بکس چرا کر غائب ہو جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک بار انہوں نے اس شرارتی بچے کو پکڑوایا تھا جو اکثر اوقات اسکول میں کسی نہ کسی ٹیچر کے ساتھ شرارت کرتا تھا اور شرارت بھی ایسی کہ ٹیچرز کو اپنی کلاس کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑتی۔ لیکن وہ شرارت کرنے والا کبھی سامنے نہیں آیا تھا۔ اس شرارتی بچے کو بھی انہوں نے ہی پکڑوایا تھا۔ ایسے ہی محلے میں ان کے بہت سے کارنامے زندہ مثال تھے۔ انہی کارناموں کی وجہ سے انہوں نے ایک دن اپنے گروپ جس میں عبیرہ، افرا اور عبیرہ کا بھائی مہد، اور کسی مشکل مشن میں عبیرہ کا چاچو شکیل جو ان کا ساتھ دیتے۔ اس گروپ کو ''مشن اسکواڈ'' کا نام دے دیا تھا۔ عبیرہ اس ''مشن اسکواڈ'' کی لیڈر تھی۔

چھٹی کا دن تھا۔ سب دوپہر میں عبیرہ کے گھر جمع تھے۔ کمرے میں بیٹھے بیٹھے مہد بولا۔

''ارے بھئی! ہمارا اسکواڈ کچھ خاموش ہے۔ نیا کارنامہ کرنے کا موڈ نہیں یا کوئی کارنامہ رہ ہی نہیں گیا۔''

''ہاں! بھئی میں بھی کل یہ ہی سوچ رہی تھی کہ کافی دن ہو گئے کوئی مشن نہیں ملا۔ کوئی ہماری بلے بلے ہی ہو جائے۔'' افرا شوخ انداز میں بولی۔

''دوستو! کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ آج آپ سب کو بلانے

کا مقصد یہ تھا کہ میری نظر میں ایک مشن ہے۔ یہ مشن ہماری نہ صرف زندگیوں کو بدل ڈالے گا بلکہ بہت سی زندگیوں کو بچانے میں اپنا کردار ادا کرے گا۔"

"زندگی بچاؤ مشن...... کیا ہم ڈاکٹر بننے جا رہے ہیں؟" عبیرہ کی بات سن کر مہد جھٹ سے بولا۔

"وہ اپنے انکل بخاری ہیں نا!" اس سے پہلے کہ عبیرہ کچھ اور بولتی افرا فٹ سے بولی۔

"کیا ہوا انکل بخاری کو...... کیا ہوا ان کی زندگی کو خطرہ ہے۔" "ایک تو پوری بات سنتے نہیں ہو اور اپنی ہی مارے جا رہے ہو۔ پوری بات تو سن لیں۔" عبیرہ نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "تو میں کہہ رہی تھی کہ پچھلے ہفتے انکل بخاری کو کالا یرقان ہوا۔ دو دن بعد پتا چلا کہ انکل بخاری کے گھر کے سامنے جو نیلے گیٹ والا گھر ہے۔ وہ رشدی صاحب کا ہے۔ نہ صرف رشدی صاحب کالے یرقان کے مریض ہوئے بلکہ ان کا تو پورا کنبہ ہی کالے یرقان میں مبتلا ہے۔ بات یہاں نہیں رکتی بلکہ ہمارے ہمسائے میں انکل خان اور ان کی بڑی بیٹی بھی کالے یرقان کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ابو جان بتا رہے تھے۔ یہ مرض ابھی اسی محلے میں پھیل رہا ہے۔ محلے کے سب لوگ بہت پریشان ہیں کیوں کہ یہ مرض جان لیوا ہوتا ہے۔ ابو جان یہ بھی بتا رہے تھے کہ محلے والوں نے سپلائی کا پانی لیبارٹری ٹیسٹ بھی کرایا ہے لیکن یہ پانی صاف ہے۔"

"پانی بھی صاف ہے۔ محلے میں گندگی بھی نہیں ہوتی۔ ایک ماہ پہلے تک صحت مند محلے کو کس کی نظر لگ گئی؟" افرا پریشانی سے بولی۔

"دودھ والے کی نظر لگ گئی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں...... دودھ والے کی نظر کیسے لگ سکتی ہے۔" افرا عبیرہ کی بات سن کر بولی۔

"دیکھو میں سمجھاتی ہوں۔" عبیرہ نے افرا اور مہد کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ عبیرہ کی باتوں میں وزن تھا۔ جو دونوں بہن بھائی اس کی بات سن کر سوچنے لگے۔

"اس کا مطلب یہ مشن اسکواڈ کا زندگی بچاؤ مشن پہلے والے تمام مشنوں سے تھوڑا مشکل ہے ضرور لیکن اگر ہم کام یاب ہو گئے تو تمغۂ جرأت تو بنتا ہے۔" مہد شوخی سے بولا۔

"لیکن ہم وہاں تک پہنچیں گے کیسے؟" افرا بولی۔

"اس سلسلے میں چاچو شکیل کو بھی اس مشن میں شامل کرنا ہوگا۔"

تو بچو! آئندہ پڑھیے کہ محلے میں کالے یرقان کے پھیلنے کا سبب کیا تھا اور مشن اسکواڈ نے کیا کارنامہ انجام دیا۔

☆☆☆

گھنا جنگل تھا اور رات کالی سیاہ، ایسے میں چند سپاہی ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔ سب سے اگلے سوار کے پاس ایک جلتی ہوئی مشعل تھی۔ یہ مشعل اٹھانے والا سپاہی خوب صورت اور تنو مند نظر آ رہا تھا۔ اس کا حلیہ اسے سردار ثابت کر رہا تھا۔ اچانک سردار کا گھوڑا رک گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ سردار نے ایڑ لگا کر جب اسے چلنے پر مجبور کیا تو گھوڑا ہنہنا کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ سردار نے دوسرے سپاہیوں کو رکنے کا اشارہ کیا اور خود نیچے اترا۔ اسے فوراً ہی گھوڑے کے خوف زدہ ہونے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس کے بالکل سامنے ایک گھنے درخت کے نیچے ایک خوف ناک اژدھا بیٹھا ہوا تھا۔ سردار نے گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دی اور پھر نیام میں سے تلوار نکال کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اژدھے کے قریب پہنچا۔ اژدھا اپنا غار جیسا منہ کھولے حملہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ سردار نے پھرتی سے تلوار کے ایک ہی وار میں اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔

یہ بہادر نوجوان ترکی کے حاکم سلطان مراد کا بیٹا سلطان محمد تھا، جو تاریخ میں سلطان محمد فاتح کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ یہاں پر دشمن ملک کے جاسوسوں کو گرفتار کرنے آیا تھا۔ وہ سب مرے ہوئے اژدھے کے قریب کھڑے تھے۔ اسی دوران لمبی داڑھی والا اجنبی کہیں سے آ نکلا۔ اس نے عجیب نگاہوں سے شہزادے کو دیکھا اور ملائم انداز میں کہنے لگا:

''شہزادے اللہ کی دی ہوئی طاقت کو اسی کی راہ میں استعمال کر کوئی ایسا کام کر جا، کہ دنیا تجھے یاد رکھے۔''

''محترم! آپ کون ہیں اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

شہزادے نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں قسطنطنیہ کی فصیل کے قریب سوئے ہوئے عاشق رسولؐ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا ادنیٰ خادم ہوں۔ آپ وہ کام کیوں نہیں کرتے جسے حضرت امیر معاویہؓ کا لشکر نہ کر سکا۔ جسے سلیمان بن عبدالمالک کی زبردست فوج نہ کر سکی۔ اور تو اور جسے آپ کے والد بھی نہ کر سکے۔''

''آپ قسطنطنیہ کی فتح کی بات کر رہے ہیں۔'' شہزادہ اجنبی کی بات سمجھ کر بولا۔

''جی ہاں! آپ بالکل صحیح سمجھے۔ میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی کام کے لیے پیدا کیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ اندھیرے میں گم ہو گیا، مگر شہزادے کو ایک نئی فکر دے گیا۔ اب وہ اٹھتے بیٹھتے قسطنطنیہ کی فتح کے منصوبے بنانے لگا۔

سلطان محمد فاتح اپریل 1429ء میں پیدا ہوا۔ وہ 1451ء میں باپ کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھا تو اس وقت اس کی عمر 23 سال تھی۔ اس زمانے میں قسطنطنیہ، سلطنت روم کا دارالحکومت اور عیسائیت کا دل ہوا کرتا تھا۔ باسفورس کی مشہور خلیج شاخ زریں ''گولڈن ہارن'' کے کنارے آباد یہ شہر ناقابل تسخیر مانا جاتا تھا۔

قسطنطنیہ کا شہر روم کے شہنشاہ قسطنطین اول نے 330 عیسوی میں آباد کیا تھا۔ یہ شہر آبنائے باسفورس کے کنارے اس مقام پر آباد ہے جہاں سے یورپ کی حد شروع ہوتی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے

کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگا، اس کو اللہ نے بخش دیا۔''

صحیح مسلم، سنن ابوداؤد اور جامع ترمذی میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''تم قسطنطنیہ کو ضرور فتح کرلو گے۔ رحمت ہو اس حکمران اور اس لشکر پر جس کے ہاتھوں اسے فتح نصیب ہو۔''

سلطان محمد فاتح تخت نشین ہوا تو بادشاہ قسطنطین نے خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ قسطنطنیہ پر حملہ کرے۔ اس وقت یہ ملک ایک بڑا تجارتی مرکز تھا۔ سلطان نے زور و شور سے جنگی تیاریاں شروع کیں اور قسطنطنیہ سے پانچ میل کے فاصلے پر اس نے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا اور اس میں جنگی ساز و سامان جمع کرنا شروع کیا۔ جب دشمن کی فوج نے سلطان کے بنائے ہوئے قلعے کو فتح کرنے کی کوشش کی تو فوج نے اسے منہ توڑ جواب دیا۔ اس نے دُم دبا کر بھاگنے میں ہی خیریت جانی۔ اس کے ساتھ ہی سلطان محمد فاتح نے پڑوسی ممالک سے دوستانہ معاہدے کیے۔ ہنگری کے ایک انجینئر نے اس زمانے میں ایک بڑی توپ بنا کر دی۔ ترکی کے کاریگروں نے ایک بڑا لکڑی کا قلعہ بنا کر دیا، جسے ہر جگہ لے جایا جا سکتا تھا۔ اسی دوران تین سو جہازوں کا بحری بیڑا تیار کیا گیا۔

دوسری جانب شاہ قسطنطین بے خبر نہیں تھا۔ اس نے حفاظتی اقدامات کرتے ہوئے شہر کی بندرگاہ کو جانے والے سمندری راستے میں موٹی موٹی زنجیریں ڈالوا کر بحری جہاز کا راستہ ہی بند کر دیا۔ دوسری جانب بڑے بڑے جنگی جہاز کھڑے کر دیے تاکہ کوئی ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرے تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

سلطان کی فوج کی تعداد اڑھائی لاکھ تھی اور تین سو بحری جہاز تھے۔ وہ پورے ڈیڑھ مہینہ دن رات شہر تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا، مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر اللہ تعالیٰ کی مدد سے سلطان محمد فاتح کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ اس کے سارے فوجی یہ ترکیب سن کر حیران رہ گئے۔ کچھ کے خیال میں ناممکن تھا، مگر سلطان کا حکم اٹل تھا۔

دراصل شہر کی بندرگاہ تک دس میل لمبا خشکی کا راستہ جاتا تھا۔ سلطان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کسی طرح بحری جہازوں کو گھسیٹ کر بندرگاہ میں اتار دیا جائے۔ اس طرح دشمن کی ساری حفاظتی تدبیریں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ سلطان کے حکم کی تعمیل ہوئی اور ساری فوج اس کام میں لگ گئی۔ باسفورس کے کنارے سے لے کر شاخ زریں کے ساحل تک زمین پر لکڑی کے بڑے بڑے تختے بچھائے گئے پھر ہزاروں جانور ذبح کر کے ان کی چربی سے تختوں پر پھسلن پیدا کی گئی۔ اس کے علاوہ تیل، روغن اور ہر طرح کی چکناہٹ استعمال کی گئی۔ راستے میں کئی جگہ اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ فوج نے اسے بھی ہموار کر کے تختے بچھا دیے۔

جب یہ کام مکمل ہوگیا تو رات کے اندھیرے میں جہاز اور کشتیاں چربی لگے تختوں پر پھسلا کر شاخ زریں کی طرف دھکیلی جانے لگیں۔ اس مشکل کام میں سینکڑوں سپاہی زخمی ہوئے۔ سلطان بذاتِ خود ساری کارروائی کی نگرانی کرتے رہے۔ صبح کی روشنی پھیلتے وقت ستر جہاز اور کشتیاں شاخ زریں میں اتر چکی تھیں۔ اس طرح بندرگاہ سلطان کے جہازوں کی زد میں آگئی۔

قسطنطین کی فوج کے لیے یہ حیرت انگیز منظر تھا۔ وہ سمجھ ہی نہ سکی کہ یہ کس طرح ہوگیا۔ انہوں نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے کئی جہاز تباہ کیے، مگر سلطان کی فوج کا زیادہ نقصان نہ ہوا۔ سلطان نے اس دوران قسطنطین کی فوج کو ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا مگر وہ نہ مانی۔ اس کے بدلے میں سلطان نے امن و امان کی ضمانت بھی دی تھی۔

پھر سلطان نے فیصلہ کن حملہ کیا۔ فجر کی نماز کے بعد فوج نے اللہ تعالیٰ سے فتح کی دعا کی اور دشمن پر جھپٹ پڑی۔ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ قسطنطین جنگ میں مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہاں ایک ہزار سالہ حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس دن عیسوی تاریخ 29 مئی 1453ء تھی۔ فتح کے بعد سلطان کی فوج نے عیسائی باشندوں کے ساتھ عمدہ سلوک کیا۔

قسطنطنیہ کا موجودہ نام استنبول ہے اور یہ ترکی کا حصہ ہے۔ سلطان محمد فاتح نے اپنے تیس سالہ دورِ حکومت میں 12 سلطنتیں اور ریاستیں اور دو سو سے زاید شہر اور قلعے فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیے۔ وہ نماز روزے کے سخت پابند تھے۔ تعمیرات کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ کئی شہروں میں مساجد تعمیر کرائیں۔ ان میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے نام پر تعمیر کرائی گئی جامع مسجد ایوبی نمایاں ہیں۔ سلطان محمد فاتح کا انتقال 2 مئی 1481ء کو ہوا۔

☆☆☆

محمد حسن انوار، جھنگ

میں بڑا ہو کر عالم دین بننا چاہتا ہوں اور دین اسلام کی روشنی ساری دنیا میں پھیلانا چاہتا ہوں۔

ثناء لیاقت، حویلی لکھا

میں بڑی ہو کر آرمی ڈاکٹر بنوں گی اور اپنے ملک کا نام روشن کروں گی۔

آمنہ نورین، ویہنہ

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی۔

عبداللہ ظفر، ساہی وال

میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور پاکستان کو دہشت گردوں سے پاک کروں گا۔

ایمان کامران، راول پنڈی

میں ڈیزائنر بن کر ملک اور قوم کی خدمت کروں گی۔

یہ ہیں پیاری سی رومیشہ حفیظ اوکاڑہ سے کہتی ہیں کہ میں ڈاکٹر بنوں گی۔

دُویا حماد، لاہور

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بن کر اپنے ملک کا نام روشن کروں گی۔

عبدالرحمن، راول پنڈی

میں فوجی بن کر ملک اور قوم کی خدمت کروں گا۔

حسنین طاہر، لاہور

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں تاکہ غریبوں کا مفت علاج کر سکوں۔

آمنہ اصغر، اسلام آباد

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

بابر علی، اٹک

میں سائیکاٹرسٹ بن کر انسان کو اہمیت دوں گا اور اس کے لیے تھیوریز اور فلسفہ پیش کروں گا۔

نایاب صدیق، راول پنڈی

میں جج بن کر انصاف کے تقاضے پورے کروں گی۔

محمد شکیل بھٹی، جھنگ

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

ارمان فاطمہ، شیخوپورہ

میری زندگی کا مقصد ڈاکٹر بن کر اپنے ملک پاکستان کی خدمت کرنا ہے۔

سبحان زاہد، خان پور

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور انسانیت کی خدمت کروں گا۔

ایمان فاطمہ، راول پنڈی

میں بڑی ہو کر مکینیکل انجینئر بننا چاہتی ہوں۔

محمد حمزہ، میانوالی

میں پائلٹ بنوں گا اور ملک کی حفاظت کروں گا۔

ردا فاطمہ، میانوالی

میں بڑی ہو کر ان شاء اللہ ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

سر الگزانڈر فلیمنگ

جس نے پنسلین ایجاد کی

کمرے میں بڑا حبس تھا اور گرمی کی وجہ سے وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ مگر اس نے دروازے اور کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں۔ وہ پھوڑے پھنسی کے جراثیم پر تجربہ کر رہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے جراثیم کھڑکی کے راستے اندر آئیں۔ پھنسی پھوڑے کے جراثیم شیشے کی ایک چھوٹی سی پلیٹ میں رکھے تھے۔ وہ خوردبین سے بار بار ان ننھے ننھے کیڑوں کو غور سے دیکھتا اور کاغذ پر کچھ لکھتا جاتا۔ جب گرمی بالکل برداشت کے باہر ہوگئی تو اس نے ایک کھڑکی کھول دی، اور جراثیم کی پلیٹ کو احتیاط سے ڈھانک دیا۔

تین چار دن کے بعد اس نے جراثیم کی پلیٹ کو جونہی خوردبین کے نیچے رکھا۔ حیرت سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''ہائیں! یہ کیا ہوا؟''

ہوا یہ کہ جس وقت اس نے کھڑکی کھولی تھی تو پھپھوندی کا ایک ذرہ ہوا کے ساتھ اندر آ گیا تھا اور جراثیم کی پلیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ یہ ذرہ بھی جراثیم لیے ہوئے تھا۔ وہ پلیٹ کی چیزوں کو اٹھا کر پھینکنے ہی والا تھا کہ اسے خیال آیا۔ لاؤ دیکھوں، پھپھوندی کے جراثیم کیسے ہوتے ہیں۔ وہ ان جراثیم کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھپھوندی کے جراثیم نے پھوڑے پھنسی کے جراثیم کے پاس ہی اپنی چھوٹی سی بستی بسا لی تھی۔ ان کے ننھے ننھے بازوؤں سے پھپھوندی کے نئے نئے جراثیم پیدا ہو رہے تھے اور ان کی آبادی بڑھتی جاتی تھی۔ پھر اس نے ایک ایسی چیز دیکھی کہ اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

اس نے جلدی سے خوردبین کو دوبارہ درست کیا۔ اب یہ چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ یہ ایک حلقہ تھا جو پھپھوندی کے چاروں صرف بن گیا تھا اور پھنسی پھوڑے کے جراثیم اس حلقے کے اندر نہیں آ پاتے تھے۔ کیا پھپھوندی کے جراثیم پھوڑے پھنسی کے جراثیم سے زیادہ طاقت ور ہیں؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا؟ کیا وہ زہریلے جراثیم کو شکست دے سکتے ہیں؟ یہ ڈاکٹر الگزانڈر فلیمنگ تھا جو لندن کے ایک اسپتال میں جراثیم پر تجربہ کر رہا تھا۔

ڈاکٹر فلیمنگ نے اب ایک ایسا شوربہ تیار کیا جو پھپھوندی کے جراثیم کی غذا ہوتی ہے۔ اس نے یہ شوربہ شیشے کی ایک نالی (ٹیوب) میں بھر کر پھپھوندی کے جراثیم کو شوربے میں ڈال دیا اور نالی کا منہ بند کر کے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ کئی ہفتے کے بعد جب پھپھوندی کے جراثیم خوب پل گئے تو ڈاکٹر فلیمنگ نے انہیں شیشے کے ایک ٹکڑے پر پھیلا دیا اور پاس ہی چند زہریلے جراثیم بھی شیشے پر رکھ دیے۔ وہ ان دو قسم کے جراثیم کی لڑائی دیکھنا چاہتا تھا۔ چند دنوں کے بعد اس نے دیکھا کہ زہریلے جراثیم کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ ان میں سے بہت سے مر گئے ہیں اور جو زندہ بھی ہیں وہ پھپھوندی کے جراثیم کے قریب جانے کی ہمت نہیں کرتے۔ مضبوط نے کم زور کو پچھاڑ دیا تھا۔ اس طرح پنی سلین ایجاد ہوئی۔ وہ مشہور دوا جس سے آج دنیا کا بچہ بچہ واقف ہے۔
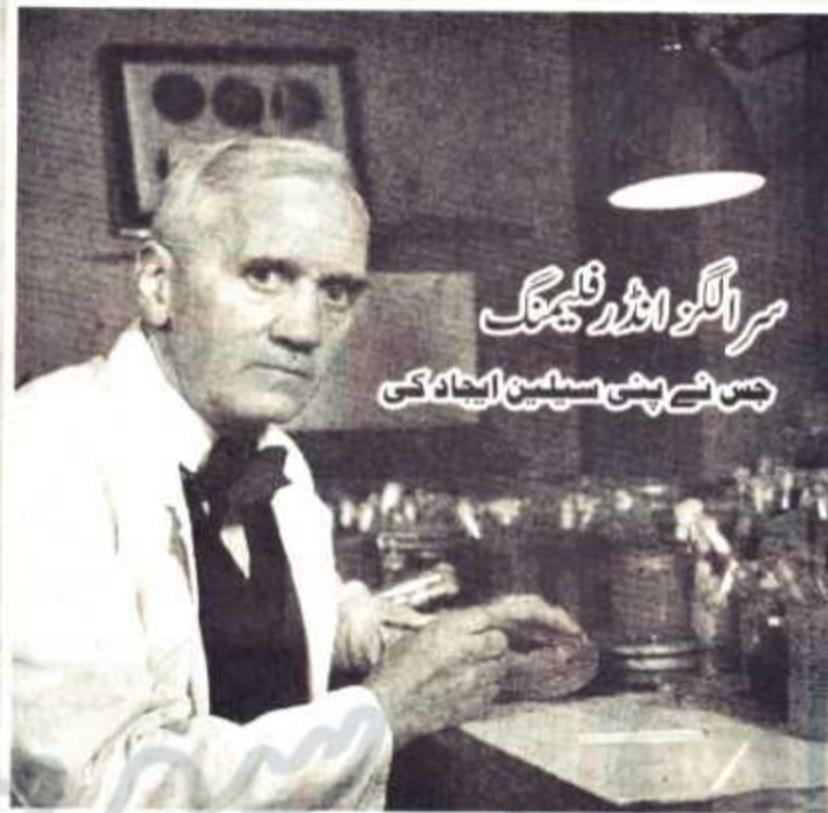
الگزانڈر فلیمنگ 6 اگست 1881ء کو اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے آٹھ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ابھی وہ سات سال کا تھا کہ اس کا باپ مر گیا۔ مگر اس کی ماں بڑی بہادر اور لائق عورت تھی۔ اس نے اپنے بچوں کی پرورش بڑی محنت سے کی۔

ننھے الگزانڈر کا اسکول گھر سے چار میل دُور تھا اور راستے میں پہاڑیاں بھی تھیں۔ وہ روزانہ پیدل اسکول جاتا اور راستے میں جو پودے، پھول اور جھاڑیاں پڑتیں انہیں بھی غور سے دیکھتا رہتا۔ وہ بڑا ذہین اور محنتی لڑکا تھا۔ ہمیشہ اپنی جماعت میں اول آتا اور کھیل

کے میدان میں بھی سب سے آگے رہتا۔

اسکول کی تعلیم ختم کر کے سولہ سال کی عمر میں وہ جہاز کی ایک کمپنی میں نوکر ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، لیکن اس کی ماں کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ الگزانڈر کی تعلیم کا خرچ برداشت کر سکتی۔

الگزانڈر بیس سال کا ہوا تو اس کا ایک رشتہ دار مر گیا اور الگزانڈر کو کچھ رقم ورثے میں ملی۔ اس نے یہ رقم فضول کاموں میں خرچ نہیں کی۔ بلکہ لندن کے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور ڈاکٹری پڑھنے لگا۔ وہاں بھی وہ اپنی کلاس میں برابر اول آتا۔ اس نے کالج کے قریب قریب سبھی انعامات جیت لیے۔ اس کے ساتھ وہ کالج کی رائفل ٹیم، پیراکی کی ٹیم اور آبی پولو کا ممبر بھی تھا۔

ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے وہ لندن کے سینٹ میری اسپتال میں ملازم ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم چھڑی تو ڈاکٹر فلیمنگ کو ایک گشتی (mobile) شفا خانے کے ہمراہ فرانس کے فوجی مورچے پر جانا پڑا۔ جراثیم کے مطالعے کا شوق اسے وہیں ہوا۔ وہ تحقیقات اور تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ جسم کے اندر زہریلے جراثیم کو مارنے کے لیے کیمیاوی دوائیں نہیں دینی چاہئیں۔ ان سے جراثیم تو مر جاتے ہیں لیکن جسم میں اور بھی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر زہریلے جراثیم کو کیمیاوی دواؤں کے بغیر ہلاک کیسے کیا جائے؟

جنگ ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر فلیمنگ سینٹ میری اسپتال میں واپس آ کر دوبارہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ ایک دن ڈاکٹر فلیمنگ کو سخت زکام تھا اور اس کی ناک بھی بہہ رہی تھی۔ اس نے سوچا ناک سے جو مواد خارج ہوتا ہے اس پر کیوں نہ تجربہ کیا جائے۔ اس نے تھوڑا سا مواد لیا اور اس کے اندر جو جراثیم تھے ان کی ''پرورش'' کرنے لگا۔ چار دن بعد اس نے ان جراثیم کو غور سے دیکھا۔ وہ بڑے ''تندرست'' نظر آتے تھے۔ اب ڈاکٹر فلیمنگ نے ناک کا تھوڑا سا مواد لے کر جراثیم کی نالی میں ڈال دیا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس مواد کے ایک قطرے نے کئی ہزار جراثیم کو ہلاک کر دیا۔ ڈاکٹر فلیمنگ اس سے اس نتیجے پر پہنچا کہ زکام کے جراثیم کو مارنے والا خود وہ مادہ ہے جو ناک سے خارج ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے تو بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ زکام اگر جاری رہے تو اچھا ہے۔

ڈاکٹر فلیمنگ نے اور تجربہ کیا تو پتا چلا کہ انسان کے خون میں، تھوک میں، آنسوؤں میں اور عورت کے دودھ میں بھی یہ مادہ موجود ہوتا ہے۔ قدرت نے خود جراثیم کو مارنے کا بندوبست کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر فلیمنگ کو جب پھپھوندی کی تاثیر کا پتا چلا تو اس نے پھپھوندی کے جراثیم کی سلائیڈ تیار کی اور ایک سائنس دان کے پاس لے گیا جو پودوں اور نباتات کے ماہر تھے۔ ڈاکٹر فلیمنگ نے ان سے پوچھا۔ ''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ جراثیم کی ایک پلیٹ میں گر گئی تھی؟'' سائنس دان نے اس سلائیڈ کو خوردبین سے دیکھا اور بولا، ''یہ پھپھوندی ہے، جو باسی ڈبل روٹی بسکٹ، پنیر وغیرہ پر نمی کی وجہ سے جم جاتی ہے۔ یہ پنی سیلین خاندان کی کائی سے تعلق رکھتی ہے۔'' اور اس نے سلائیڈ ڈاکٹر فلیمنگ کو واپس کر دی۔

ڈاکٹر فلیمنگ نے تجربہ جاری رکھا اور تجربے نے اسے بتایا کہ پھپھوندی کے جراثیم کی پرورش جس شوربے میں ہوتی ہے۔ اس پر زرد رنگ کا ایک سیال مادہ تیرنے لگتا ہے۔ یہ سیال مادہ جسے ہم کائی کہتے ہیں، زہریلے جراثیم کو بالکل ہلاک کر دیتا ہے۔ اب ڈاکٹر فلیمنگ یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے کہ اس پھپھوندی یا کائی کا اثر جان دار چیزوں پر کیا ہوتا ہے۔ پھپھوندی کے جراثیم جان دار چیزوں کو نقصان تو نہیں پہنچاتے۔

ڈاکٹر فلیمنگ کے اسپتال میں خرگوش اور چوہے تجربے کی خاطر پالے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض تندرست تھے اور بعض بیمار۔ اس نے پھپھوندی کا سیال مادہ بیمار اور تندرست دونوں قسم کے جانوروں کے جسم میں ٹیکے کے ذریعے داخل کر دیا۔ تندرست جانوروں پر ٹیکے کا کوئی اثر نہیں ہوا، البتہ بیمار جانور اچھے ہو گئے۔ پنی سیلین کا تجربہ کامیاب ہو گیا۔

ابتداء میں تو پنی سیلین فقط ان بیماروں کو دی گئی جن کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہ گئی تھی۔ جب یہ تجربہ بھی کامیاب ہو گیا تو پنی سیلین کا ٹیکہ بالکل عام ہو گیا۔

اس ایجاد کی بدولت ڈاکٹر فلیمنگ ساری دنیا میں مشہور ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم میں لاکھوں زخمیوں اور بیماروں کی جان پنی سیلین ہی کی بدولت بچی۔ 1943ء میں ڈاکٹر فلیمنگ کو دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائز ملا۔ 1944ء میں برطانوی حکومت نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں ''سر'' کا خطاب دیا۔ 1955ء میں ڈاکٹر فلیمنگ کا انتقال ہو گیا۔ ☆☆☆☆☆

چوڑیاں

عید، بقر عید، شادی بیاہ کے موقع پر خواتین اور لڑکیاں خوب صورتی اور شوق کی خاطر رنگ برنگی چوڑیاں (Bangles) پہنتی ہیں۔ چوڑیاں سخت دھات، لکڑی، شیشے یا پلاسٹک وغیرہ کی بنی ہوتی ہیں۔ بالخصوص پاکستان، بھارت، افغانستان، نیپال اور بنگلہ دیش

میں بہ طور زیور اور آرائش (Ornaments) اہتمام کیا جاتا ہے۔ بالخصوص شادی شدہ خواتین چوڑیاں پہنتی ہیں۔ چاند رات کو سہیلیاں ایک دوسرے کو تحفتاً بھی چوڑیاں دیتی ہیں۔ کبھی بطور ''Contrast'' اور کبھی لباس کے ساتھ ''Match'' کر کے پہنی جاتی ہیں۔ فارسی میں چوڑیوں کو ''النگو'' پشتو میں ''بنکری''، بلوچی میں ''بنگڑی'' جب کہ نیپالی میں ''چوڑا'' کہا جاتا ہے۔ آثار قدیمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ 2600 سال قبل مسیح یعنی موہنجوڈرو (Mohenjo Daro) عہد کی خواتین بھی خوشی کے موقع پر چوڑیاں پہنتی تھیں۔ چوڑیاں گولائی کی شکل میں ہوتی ہیں اور یہ ہاتھوں میں پہنی جاتی ہیں۔ پاکستان میں صوبہ سندھ کا شہر حیدر آباد چوڑی سازی میں خاص مقام رکھتا ہے۔

ہوبارا باسٹارڈ

ہوبارا بسٹارڈ (Houbara Bustard) ایک خوب صورت پرندہ ہے جو شمالی افریقہ سے جنوبی ایشیا تک پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں سندھ، بلوچستان کے علاقے میں یہ پرندہ پایا جاتا ہے۔ دریائے

سندھ کے ساتھ جنوبی پنجاب کے علاقوں میں بھی قطری شہزادے اور متحدہ عرب امارات کے شہزادے ان کا شکار کھیلنے آتے ہیں۔ ہوبارا کا تعلق جانوروں کی کلاس ''Aves'' سے ہے۔ جب کہ ان کا سائنسی نام (Chlamydotis Undulata) ہے۔ جب کہ ان کا تعلق ''Otidiade'' خاندان سے ہے۔ اس کے جسم پر گہرے بھورے پَر ہوتے ہیں جن کے کناروں پر سیاہ لائن ہوتی ہے۔ اس پرندے کی لمبائی 55 سے 65 سینٹی میٹر (22 سے 26 انچ) اور پَروں کا پھیلاؤ 135 سے 170 سینٹی میٹر (53 سے 67 انچ) ہوتا ہے۔ نیچے سے ان کا جسم سفید دکھائی دیتا ہے۔ مادہ پرندے کی دُم چھوٹی جب کہ نر پرندے کی دُم بڑی ہوتی ہے۔ نر (Male) پرندے کا وزن 1.50 سے 2.50 کلو گرام جب کہ مادہ

(Female) پرندے کا وزن 1.00 سے 1.50 کلو گرام ہوتا ہے۔ یہ پرندہ بیج، حشرات وغیرہ کھاتا ہے۔ اس پرندے کی بقا کو جنگلات کی کمی اور شکار کی وجہ سے خطرات لاحق ہیں۔ اس لیے UNO نے اسے محفوظ کرنے کے منصوبے پر کام شروع کر دیا ہے۔

زیرہ

زیرہ (Zeera) ایک پھول دار پودا ہے جسے عربی زبان میں ''کمون'' فارسی میں ''زیرہ سبز'' اور انگریزی میں ''Cumin'' کہا جاتا ہے۔ زیرہ کا سائنسی نام ''Cuminum Cyminum'' جب کہ اس کا خاندان ''Apiaceae'' ہے۔ یہ پودا مشرقی بحیرۂ روم سے جنوبی ایشیا تک پایا جاتا ہے۔ اس پودے کے بیج (Seeds) کو مصالحہ جات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی کھانے

میں ثابت اور کسی ڈش میں پاؤڈر کی شکل میں ڈالا جاتا ہے۔ زیرے کا پودا 30 سے 50 سینٹی میٹر (12 سے 20 انچ) اونچا ہوتا ہے۔ یہ ایک برس کی عمر رکھتا ہے۔ اس کے تنے کی لمبائی 20 سے 30 سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ جب کہ تنے کی موٹائی (Diameter) 3 سے 5 سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ تنے پر شاخیں ہوتی ہیں اور ہر شاخ دو سے تین مزید شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ پتے 5 سے 10 سینٹی میٹر لمبے اور دھاگہ نما باریک ہوتے ہیں۔ پھول چھوٹے اور گچھے کی مانند نکلتے ہیں جسے ''Umbel'' کہا جاتا ہے۔ اس پودے کا پھل ''Achene'' کہلاتا ہے جس میں سے زیرے کے بیج نکلتے ہیں۔ پاکستان، بھارت، ازبکستان، ایران، ترکی، تاجکستان، مراکو، مصر، شام، چلی، میکسیکو اور چین زیرہ پیدا کرنے اور استعمال کرنے والے بڑے ممالک ہیں۔ زیرہ کھانے سے وٹامن A، B، C، D، E اور وٹامن K کے علاوہ نمکیات بھی حاصل ہوتے ہیں۔

فارمک ایسڈ

فارمک ایسڈ (Formic Acid) درحقیقت لاطینی زبان کے لفظ فارمیکا (Formica) سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے ''چیونٹی یا Ant۔'' ایک برطانوی سائنس دان ''John Ray'' نے پہلی مرتبہ یہ ایسڈ چیونٹیوں کے ڈنک سے معلوم کیا۔ 1671ء میں اس ایسڈ کو فارمک ایسڈ کا نام دیا گیا۔ کچھ پودوں مثلاً ''Stinging

Nettles'' کے پتوں اور تنے کو ہاتھ لگنے سے بھی جسم میں خارش ہو جاتی ہے۔ جو فارمک ایسڈ کی وجہ سے ہے۔ سائنسی اصطلاح میں فارمک ایسڈ ایک سادہ کار باکسلک ایسڈ (Carboxylic Acid) ہے۔ جس کا کیمیائی فارمولہ ''HCOOH'' یا ''HCO_2H'' ہے۔ یہ بے رنگ اور چبھنے والی بو رکھتا ہے۔ اس کا نقطۂ پگھلاؤ 8.4 سینٹی گریڈ (47.1 فارن ہائیٹ) اور نقطۂ کھولاؤ 100.8 سینٹی گریڈ (213.4 فارن ہائیٹ) ہے۔ فارمک ایسڈ کو بیکٹر یا کش ادویات اور ربڑ کی تیاری میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جلدی امراض (Warts) کے علاج میں بھی یہ ایسڈ بے نظیر خصوصیات کا حامل ہے۔ انسانی جلد میں داخل ہونے پر یہ ایسڈ جلن اور کھجلی پیدا کرتا ہے۔ جرمنی، چین، فن لینڈ اور امریکہ میں صنعتوں میں بھی فارمک ایسڈ استعمال ہوتا ہے۔ ☆☆☆

راشد علی نواب شاہی

پیارے اللہ کے پیارے نام

اَلْوَاسِعُ جَلَّ جَلَالُہٗ (وسعت وکشادگی دینے والا)

اَلْوَاسِعُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ غنی ہے جس کی سخاوت تمام بندوں کے لیے کافی ہے اور اس کا رزق تمام مخلوقات کے لیے وسیع ہے۔

یہ مبارک نام قرآن کریم میں نو مرتبہ آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات بنائی۔ ہم اس کائنات کی وسعت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ آسمان کتنا وسیع ہے، ساری زمین کے پہاڑوں کی لمبائی کی کوئی حد نہیں زمین میں چھپے ہوئے خزانے کتنے ہیں؟ کوئی نہیں بتا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اتنے ہیں کہ روزانہ ستر ہزار فرشتے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں اور قیامت تک دوبارہ کسی کی باری نہیں آئے گی۔ ان فرشتوں کو گننے کا کسی کے پاس کوئی آلہ نہیں۔

وہ ایک حکومت

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو بڑی بادشاہت عطا فرمائی تھی، جنات، انسان، چرند پرند اور ساری دنیا پر ان کی حکومت تھی جنات، انسان اور پرندے ان کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ جو حکم فرماتے وہ ان کو پورا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو بھی ان کے حکم کے تابع کر دیا تھا۔ جس کے ذریعے وہ دُور دراز کا سفر چند ہی منٹوں میں پورا فرما لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ اپنے لشکر کے ہم راہ تشریف لے جا رہے تھے، پرندے ان پر سایہ کیے ہوئے تھے، انسان اور جن ان کے دائیں بائیں تھے اور آپ اپنی پوری شان وشوکت سے رواں دواں تھے۔

راستے میں آپ کا گزر ایک کسان پر ہوا، اس نے آپ کی شان وشوکت اور بادشاہت سے متاثر ہو کر کہا: ”سبحان اللہ!“

یہ کلمہ ہوا کے ذریعے سے حضرت سلیمانؑ تک پہنچ گیا، حضرت سلیمانؑ اس کسان کے پاس آئے اور فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے: میں تمہارے پاس صرف اس وجہ سے آیا ہوں، تاکہ تم غم گین نہ ہو تمہارے پاس بادشاہت اور نوکر و چاکر نہیں ہیں، کیوں کہ کسی مسلمان کا ایک مرتبہ ”سبحان اللہ“ کہنا، سلیمان کی ساری سلطنت سے کئی گنا بڑھ کر ہے۔ اس لیے یہ ساری بادشاہت ایک دن ختم ہو جائے گی، لیکن تمہارا ”سبحان اللہ!“ کہنے کا ثواب ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

کشادہ گھر

ہم سب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بہت محتاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت بڑا، اور وسیع گھر ہے۔

گھر کی وسعت اور بڑا ہونا ایک تو یہ ہے کہ گھر لمبا چوڑا ہو۔ اور دوسری کشادگی یہ ہے جب ہم گھر جائیں تو چین اور سکون نصیب ہو۔ امی، ابو، بہن، بھائی سب خوش ہو جائیں۔ اس لیے

حضورؐ نے ہمیں ایک دعا سکھائی ہے، وضو کرتے وقت اسے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَ وَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِکْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ''

ترجمہ: ''اے اللہ! میرے گناہ معاف فرما، میرے گھر میں کشادگی اور وسعت فرما، اور میرے رزق میں برکت عطا فرما۔''

یاد رکھنے کی باتیں

☆ اس مبارک نام سے ہمیں یہ سبق ملا کہ وضو کے وقت جو دعا لکھی گئی ہے، اسے یاد کریں اور دوسرے بہن بھائیوں، دوستوں کو یاد کروائیں اور خود بھی وضو کے دوران میں پڑھنے کا اہتمام کریں۔

☆ جب اللہ تعالیٰ ''اَلْوَاسِعُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' ہیں، ساری وسعتوں کے خزانے اس کے پاس ہیں تو پھر ان کے در کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف نظر کیوں اٹھائیں؟ صرف اور صرف ''اَلْوَاسِعُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' سے مانگیں۔

☆ امی ابو سے پوچھ کر اور کسی عالم صاحب سے رہ نمائی لے کر ہم بھی دوسرے غریب دوستوں کی مدد کریں۔ اپنے حصے کی چیز بھی انہیں کھلائیں اور ان کے لیے اپنا دل بڑا رکھیں۔

☆☆☆

ابنِ بطوطہ

رابیکا شاہد شیخ

چودھویں صدی کا سب سے بڑا مسلمان سیاح ابنِ بطوطہ ہے۔ وہ 1304ء میں مراکش کے شہر طنجہ میں پیدا ہوا۔ ابنِ بطوطہ کو بچپن ہی سے جغرافیہ پڑھنے کا شوق تھا اور وہ اس بات کو بخوبی جانتا

تھا کہ جب دنیا اتنی وسیع ہے تو اس میں رہنے والے مختلف لوگ مختلف بود و باش رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں سفر کے لیے اچھی سڑکیں بہت ہی کم تھیں، راستے محدود تھے۔ چوروں کا بھی کھٹکا ہر وقت لگا رہتا تھا بلکہ مشکل ہی سے کوئی راستہ راہ زنوں سے محفوظ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں سیاح کو گھوڑوں پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ جو نقشے اور چارٹ وغیرہ ان کو میسر آتے تھے، وہ بھی درست نہیں ہوتے تھے جس کی وجہ سے ان کی رہنمائی مشکل ہو جاتی۔ ان تمام مشکلات کے باوجود ابنِ بطوطہ نے دنیا کی سیاحت کا ارادہ کیا۔ اس نے دنیائے اسلام کے ان تمام ممالک کی سیاحت کی بلکہ وہ پہلا مسلمان سیاح تھا جس کو چین دیکھنے کا موقع ملا۔

ابنِ بطوطہ نے اکیس برس کی عمر میں ایک قافلے کے ہمراہ، جو تیونس سے مصر جا رہا تھا، سفر کیا۔ مصر پہنچ کر اسکندریہ کی مشہور بندرگاہ دیکھی۔ اس نے روشنی کا وہ مینار دیکھا جو کہ دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ اسے قاہرہ کی بڑی بڑی مساجد بہت پسند آئیں۔ مصر سے ابنِ بطوطہ شام روانہ ہوگیا۔ شام سے حاجیوں کے قافلے کے ہمراہ دمشق سے مکہ معظمہ پہنچا۔ حج ادا کیا اور پھر وہ عراق اور ایران کی سیاحت پر گیا اور کچھ عرصہ مکہ میں مقیم رہا۔ یہاں وہ تمام دنیا سے آئے ہوئے حاجیوں سے نہایت شوق سے ان کے واقعات سنتا۔

اس دوران ایک حاجی نے مشرقی افریقہ کا ذکر کیا۔ اسے دیکھنے کے شوق میں ابنِ بطوطہ مکہ سے عدن روانہ ہوگیا۔ وہاں سے ممباسہ گیا اور پھر تیسری مرتبہ واپس مکہ چلا گیا۔

ابنِ بطوطہ کا چوتھا سفر وسطی ایشیا کی طرف تھا۔ اس نے ایشیائے کوچک سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ یہاں سے وہ روس کے جنوبی علاقے سے گزرتا ہوا ازبک خان کے دربار میں پہنچا جو مسلمانوں کا امیر تھا۔

ابنِ بطوطہ کے لیے پہاڑی علاقے میں برف باری ایک نیا مشاہدہ تھا۔ اس نے یہاں بار برداری کے لیے کتوں کو گاڑیوں میں جتا دیکھا تو حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ اس نے شمالی علاقوں میں موسم گرما میں دن طویل ہونے کا ذکر کیا کہ رمضان کے مہینے میں عشاء کی نماز پڑھنے کے لیے مشکل سے وقت ملتا ہے۔ وہاں سے ابنِ بطوطہ قسطنطنیہ گیا، پھر بخارا، سمرقند اور کابل کے راستے سے ہوتا ہوا سکھر اور ملتان کے راستے دہلی پہنچا۔ (بقیہ: صفحہ نمبر 63)

آپ میاں مانگتے اور باہر کھڑے درویش

گداگروں کی اس گندی بستی کا نام ڈھیری تھا جہاں شہر کے سارے گداگر کچے مکانوں اور پھونس کے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ بستی کے درمیان ان کے چوہدری کا کچا پکا ڈھارا تھا۔ سارا دن بھیک مانگنے کے بعد یہ لوگ اپنی اسی بستی میں واپس آکر اپنی دن بھر کی آمدنی میں سے چوہدری کا مقررہ حصہ ادا کر کے اپنی اپنی جھونپڑیوں میں چلے جاتے۔ بعض ایسے بھی تھے جو رات گئے تک شہر کے بازاروں اور گلی محلوں میں صدائیں لگایا کرتے۔ انہیں میں سے ایک لکھو بھی تھا۔

ایک رات لکھو معمول کے مطابق دیر سے واپس آیا۔ ڈھیری کی سب جھونپڑیاں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ سرد رات کے سناٹے میں صرف ہوا کی سرسراہٹ اور ہلکی ہلکی بارش کی رم جھم سنائی دے رہی تھی۔ لکھو نے چولہا سلگایا، آگ تاپتے ہوئے اسے چائے کی طلب ہوئی۔ چولہے پر پانی رکھا، صبح کا بچا ہوا ذرا سا دودھ تو پڑا تھا مگر دیکھا تو پتی کا ڈبہ خالی تھا۔ بے چارا بڑا مایوس ہوا۔ پھر بھی باہر نکل کر نگاہ دوڑائی۔ چاروں طرف اندھیرا تھا، صرف چوہدری کے جھونپڑے میں دیا ٹمٹما رہا تھا۔ لکھو اسی طرف چل پڑا اور باہر کھڑے ہو کر اپنے اسی گداگروں کے لہجے میں صدا لگائی: ”چوہدری بابا! تیرے بچے جئیں! ایک ذرا سی چائے کی پتی کا سوال ہے بابا!“

”لو! یہ اس وقت آدھی رات کو کون بدبخت آگیا پتی مانگنے؟“ چوہدری غصے میں آکر بولا۔

”ایسا نہ کہو! شاید اللہ کا کوئی نیک بندہ ہو، کوئی پہنچا ہوا درویش ہو جو ہماری آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہو...... دے آتی ہوں تھوڑی سی پتی!“ چوہدری کی بیوی نے کہا۔

”واہ! یہ بھی خوب رہی کہ آپ میاں مانگتے اور باہر کھڑے درویش۔ آزمائش بھی کرنی ہے تو دولت مندوں کی کریں، جو خود مانگ کر کھاتے ہوں ان کو کیا آزمانا۔“

چوہدری بڑبڑاتا رہا، مگر اس کی بیوی دروازے پر جا کر لکھو کو تھوڑی سی پتی دے آئی۔ ادھر چوہدری کو اچانک کچھ یاد آگیا اور وہ چونک کر بولا: ”ارے! آج وہ لکھو ابھی تک حصہ دینے نہیں پہنچا؟“ اور لکھو چوہدری کی بات پر ہنستے ہوئے چائے بنا رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا: واہ واہ! چوہدری نے بھی کیا خوب بات کہی ہے کہ آپ میاں مانگتے اور باہر کھڑے درویش۔

☆☆☆

تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کوئی نئی تہذیب وجود میں آئی وہ دریاؤں کے کناروں پر آباد ہوئی۔ مثلاً وادی سندھ کی تہذیب، مصر میں دریائے نیل کے کنارے پروان چڑھنے والی تہذیب، اسی طرح جب آریہ قوم پنجاب کے راستے برصغیر میں وارد ہوئی تو انہوں نے اپنے پہلے پڑاؤ کے لیے دریائے جہلم کے کنارے کو منتخب کیا اور اسے اپنا مسکن بنایا۔ آریہ قوم فطری مظاہر مثلاً چاند، سورج اور ستاروں کی پوجا کرتے تھے۔

آریہ قوم جب وادی جہلم میں آباد ہوئی تو اس قوم کے مبلغین نے اپنے پوجا پاٹ کے لیے قریب ہی ایک ٹیلہ کو منتخب کیا جو آنے والے وقتوں میں ٹلہ جوگیاں کے نام سے مشہور ہوا یعنی "جوگیوں کا پہاڑ" ٹلہ جوگیاں ایک خوب صورت اور پُر فضا مقام پر واقع ہے جو کہ ہندوؤں کے ابتدائی دور میں مذہبی درس گاہ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ ہندو مذہب سے پہلے یہ ٹلہ سورج پرست قوم کی عبادت گاہ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

ٹلہ جوگیاں جہلم سے مغرب کی جانب 35 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، ٹلہ جوگیاں مشرقی سالٹ رینج کی بلند ترین چوٹی پر واقع ہے، یہ سطح سمندر سے 975 میٹر بلندی پر ہے۔ جرنیلی سڑک (جی ٹی روڈ) سے دریائے جہلم کا پل پار کرتے ساتھ ہی مغرب کی جانب دُور سے ہی ٹلہ کے سلسلہ وار جامنی، سرمئی رنگ کے پہاڑ نمودار ہوتے ہیں۔ ٹلہ کی بلندی سے وادی کا منظر نہایت خوب صورت اور سحر انگیز نظر آتا ہے اور یہاں کا ماحول چاروں طرف سے پُر اسراریت لیے ہوئے ہے۔

ٹلہ جوگیاں ہر دور میں مذہبی عقائد کے ماننے والوں کا اہم مرکز رہا ہے۔ ٹلہ جوگیاں کی تاریخ تقریباً 2000 قبل از مسیح پر محیط ہے کبھی یہاں سورج پرستوں کا راج رہا تو کبھی بدھوں نے اسے اپنا مقدس مقام بنایا تو کبھی ہندوؤں کے جوگیوں نے اسے اپنا مذہبی استھان کا درجہ دیا۔ ٹلہ کی یہ حیثیت قبل مسیح سے ہی خاص شہرت کی حامل بنی۔ ابتداء میں اسے کوہ بالناتھ کا نام دیا گیا۔ ٹلہ جوگیاں ہزاروں صدیوں سے لے کر قیام پاکستان تک اپنی روحانی اقدار کی وجہ سے ہندومت کے ماننے والوں کے لیے مقدس رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وارث شاہ کی کہانی ہیر رانجھا کے اہم کردار رانجھا بھی روحانی سکون کی خاطر ٹلہ جوگیاں کے مقام پر پہنچا اور کچھ عرصہ یہاں قیام کیا۔

ٹلہ کو گورو گورکھ ناتھ کی آمد کے بعد اصل شہرت ملی جو کہ صدیوں سال قبل اس علاقے میں آئے تھے اور اسے ہندوؤں کی عبادت گاہ کی حیثیت سے شہرت دلائی تھی۔ ٹلہ کے ناتھ جوگیوں کا

سلسلہ بڑا وسیع ہے اور ان جوگیوں نے یہاں کی تہذیب وتمدن پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

ٹلہ جوگیاں کی بلندی پر اردگرد تین گروپوں میں یادگاریں تعمیر کی گئی ہیں۔ جو اس طرح ہے کہ کُل بارہ مندر ہیں جن میں سے تین چھوٹے مغربی جانب کے بڑے تالاب کے کنارے ہیں، تینوں مندر مربع شکل میں چوکور پتھروں کے ساتھ بنائے گئے جب کہ سات مندر شمال مغرب کی جانب ہیں اور دو مندر مشرق کی جانب واقع ہیں۔ ٹلے پر تالاب بھی ہیں جو پانی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بنائے گئے۔ وسطی تالاب میں نیچے جانے کے لیے چاروں جانب وقفے وقفے سے 10 سیڑھیاں نیچے اترتی ہیں اس کے علاوہ سطح زمین سے نیچے کی جانب گرنے والے پانی کی ڈھلوان کے دونوں اطراف نیم مسدس نما مینار کھڑے ہیں۔ تالاب بارش کے پانی سے بھرا جاتا تھا۔ تالاب کے اطراف میں جوگیوں کے ٹھکانے ہیں، جہاں وہ اپنی تپسیا (عبادت) کیا کرتے تھے۔

ٹلہ ہر دور کے حکمرانوں کے لیے عقیدت کا باعث رہا ہے۔ ہر حکمران نے اس ٹلہ کی تزین و آرائش کا خیال رکھا اور اسے علاقے کے جوگیوں کے لیے وقف رکھا۔ آئین اکبری میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ٹلہ ہندوؤں کی ایک قدیم عبادت گاہ کے طور پر بھی مشہور تھا اور لوگ دُور دُور سے یہاں عبادت کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان پجاریوں کے کھانے پینے اور چڑھاوؤں کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد تھا اس کمیٹی کے سربراہ کو ''مہنت'' کہتے ہیں۔

سوا تین سو صدیاں قبل مسیح جب پنجاب میں سکندر اعظم اپنی فتوحات کرتا اس علاقے میں پہنچا تو اس نے گُرجاکھ کے مقام سے ٹلہ کو بلندی سے دیکھا، وہاں کے مقامی لوگوں نے اسے بتایا کہ ٹلہ جوگیوں اور درویشوں کا سب سے بڑا اور مقدس استھان ہے جہاں دوسرے علاقوں سے بھی لوگ یہاں عبادت اور علاج کی غرض سے آتے ہیں اور وہاں کے جوگیوں کی عبادت سے متعلق معلومات سکندر اعظم کو فراہم کیں، جس میں مقدس گائیوں کے دودھ سے خوراک حاصل کرنا اور مقامی جڑی بوٹیوں سے بیماروں کے کام یاب علاج کے بارے میں معلومات تھیں۔ سکندرِاعظم نے جب یہ باتیں سنیں تو ٹلہ پر حاضری دینے کا ارادہ کیا اور اپنے ہاتھی کو چڑھائی والے راستے پر ڈال دیا مگر ہاتھی چڑھائی کی وجہ سے راستے میں ہی ہلاک ہوگیا پھر سکندر کو پیدل جوگیوں کے استھان تک جانا پڑا یہی وہ ٹلہ ہے جہاں رلجہ پورس اور سکندر اعظم کے درمیان جنگ کا ہیڈ کوارٹر بنا۔ یونانی مورخ پلوٹارک نے اس پہاڑی کو ''ہاتھیوں کا ٹلہ'' کا نام دیا۔ جب سکندر اعظم اس علاقے میں آیا تھا تو اس وقت ٹلہ کا نام بالناتھ تھا بعد میں یونانی مورخ لکھتا ہے کہ بالناتھ یہاں سورج کا دیوتا مانا جاتا تھا اسی لیے اسے ''سن گاڈ'' کا بھی نام دیا گیا۔ اس دور میں یونانی بھی سورج پرست تھے، اس بالناتھ کے مندر کے آثار آج بھی موجود ہیں۔

1540ء میں شیر شاہ سوری نے بھی ٹلہ جوگیاں کے بارے میں بہت سن رکھا تھا اس زمانے میں جودھا ناتھ جوگی ٹلہ پر گدی نشین تھا۔ اس جوگی کی بھی کئی کرامات دُور دُور تک مشہور تھیں۔ شیر شاہ سوری تک ان کرامات کی شہرت پہنچی تو وہ خاص کر اس جوگی کے استھان پر حاضری دینے پہنچا تو اسے علاقے کی پُرفضا وادی بے حد پسند آئی۔ کہتے ہیں کہ اس نے اس جگہ اپنے لیے ایک قیام گاہ بنانے کا فیصلہ کیا مگر اسی رات خواب میں کسی بزرگ نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا۔ اگلی ہی صبح وہ سیدھا جودھا ناتھ جوگی کے پاس گیا اور اسے اپنی خواہش بھی بتائی اور خواب بھی۔ جس پر اس جوگی نے کہا کہ یہ مقام صدیوں سے جوگیوں کا استھان ہے، یہاں بادشاہوں کا کیا کام؟ شیر شاہ سوری کو یہ مقام اس قدر پسند آیا کہ اس نے اس مقام سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قلعہ تعمیر کروایا جو آج قلعہ روہتاس کے نام سے مشہور ہے۔

ٹلہ جوگیاں قیام پاکستان 1947ء تک صدیوں سے اپنی رونقوں کے ساتھ قائم ودائم رہا مگر قیام پاکستان کے بعد اس ٹلے پر ویرانیوں نے سایہ کرلیا اور وہاں کے مندر اب ویران پڑے ہیں، تالاب میں پانی تو ہے مگر وہ کائی زدہ ہے، ایک ریسٹ ہاؤس بھی ہے وہ بھی ویران پڑا ہے کبھی کوئی سیاح اس طرف چلا جائے تو خشک پتوں کی چڑچڑاہٹ سے کسی کی موجودگی کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔

ٹلہ جوگیاں پر جب بالناتھ جوگی آیا تو اس ٹلہ کی شہرت دُور دراز علاقوں تک پہنچی کیوں کہ اس کے جوگیوں کی روحانی قوت کا شہرہ زمانے بھر میں ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں عوام، راجے، بادشاہ، درویش سب اس استھان پر حاضری دینا فرض سمجھتے تھے۔

(بقیہ صفحہ نمبر 12 پر)

اب تو کچھ اور ہی اعجاز دکھایا جائے
شام کے بعد بھی ، سورج نہ بجھایا جائے
موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

☆

ابھی سوکھی نہیں دیوار گھر کی
کہ پھر بارش کا موسم آگیا ہے

(میمونہ نوید، راول پنڈی)

آتے ہوئے اذاں تو جاتے ہوئے نماز
اتنے قلیل وقت میں آئے چلے گئے

(مائرہ حنیف، بہاول پور)

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برگ
وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

(حسن جاوید گوریجہ، اسلام آباد)

مسجدوں کے عوض فردوس ملے یہ بات مجھے منظور نہیں
بے لوث عبادت کرتا ہوں بندہ ہوں تیرا مزدور نہیں

(افراح اکبر، لاہور)

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

(مومنہ عامر حجازی، لاہور)

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

(حیدر علی حجازی، لاہور)

اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے

☆

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

(معتصم الہیٰ، شیخوپورہ)

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

(طلحہ باقر، فتح پور)

باغ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں
گر یار ہیں تو ہم ہیں اغیار ہیں تو ہم ہیں
وابستہ ہے ہمیں سے گر جبر ہے و گر قدر
مجبور ہیں تو ہم ہیں مختار ہیں تو ہم ہیں

(سلمان یوسف سمیجہ، علی پور)

تو شاہیں ہے ، پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہے

(عائشہ ہارون، کراچی)

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

(عدن سجاد، جھنگ صدر)

اس قدر ظرف بھی رکھتے ہیں زمانے والے
زندگی چھین کر جینے کی دعا دیتے ہیں

(فصیح ظفر منظور، گوجرانوالہ)

حادثے سے بڑا سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر

(خدیجہ تحریم، رینالہ خورد)

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

(محمد اسامہ جمیل)

نہیں آتی تو ان کی یاد مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

(حرا ظفر، گوجرانوالہ)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(احور کامران، لاہور)

1- ایک موسم ہے بارہ ہیں پھل
سبھی ٹھنڈے میٹھے لال گلابی
ہر پھل کے بیج اور کھال الگ الگ
ہر پھل کا ذائقہ ہے الگ الگ

2- پہاڑ کے اوپر ایک پہاڑ
اس کے اندر ایک غار
جو بھی اس کے اندر جائے
دھول بن کر واپس آئے

3- اوپر ٹہنی ہے لمبی سی
نیچے بنا ہے پھول
وہاں جو جائے اس کو دیکھے
وہ ہے بڑا ہی مقبول

(مسکان آصف، قصور)

4- دھرا پڑا ہے سرخ پیلا
جا کر باغ سے اسے اٹھا لا

(عائشہ مریم، چونیاں)

5- دن کو سوئے رات کو روئے
جتنا روئے اتنا کھوئے

(عثمان حمزہ، چونیاں)

6- جامنی وردی والا بیٹھا ہے چوکیدار
ہری ٹوپی پہنے کرتا ہے انتظار

(عمر معظم، چونیاں)

7- جال بنا ہے جنگلا، جنگلا ہے یا بنگلہ
جنگلے میں ایسے بیٹھے، جنگلا ہو جیسے بنگلہ

(فرح نثار، چونیاں)

8- ایک پرندہ ایسا
جس کی دم پر ہے پیسہ

(عبدالرافع، لاہور)

جوابات: 1- سال کے بارہ مہینے 2- چکی 3- مینار پاکستان 4- گلاب کا پھول 5- موم بتی 6- بینگن 7- مکڑی 8- مور

صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ حبیب ابھی تک سو رہا تھا۔ اس دوران امی اسے دو بار جگانے آئی تھیں اور حبیب ''اچھا، اٹھتا ہوں۔'' کہہ کر دوبارہ سو جاتا تھا۔ حبیب کی امی تیسری بار اسے جگانے آئیں تو وہ ابھی تک سو رہا تھا۔

''حبیب بیٹا! ساڑھے سات بج چکے ہیں۔ آپ کو اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔'' حبیب کی امی نے ایک بار پھر اسے جگاتے ہوئے کہا۔

''امی! میں آج اسکول نہیں جاؤں گا۔'' حبیب نے جواب دیا تو اس کی امی بے اختیار چونک پڑیں۔

''کیوں۔ آپ آج اسکول کیوں نہیں جا رہے؟'' حبیب کی امی کا لہجہ سوالیہ تھا مگر حبیب نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس لئے حیران ہو رہی تھیں کہ حبیب نے چند روز پہلے بھی وجہ بتائے بغیر اسکول سے چھٹی کی تھی۔ اس دن بھی انہوں نے اس سے چھٹی کرنے کی وجہ پوچھی تھی مگر وہ ٹال گیا تھا اور ان کے خیال کے مطابق حبیب اب بھی انہیں ٹال رہا تھا۔

''حبیب......حبیب بیٹا۔''

''جی امی!۔'' حبیب نے کروٹ بدل کر مچی مچی آنکھوں سے امی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میں نے پوچھا ہے کیوں۔''

''بس میں نے آج اسکول نہیں جانا۔'' حبیب سے جواب نہ بن پایا تو اس نے صرف اتنا ہی کہا اور دوبارہ کروٹ بدل لی۔

''کوئی وجہ بھی تو ہوگی جو آپ ہر دوسرے تیسرے دن اسکول سے چھٹی کر لیتے ہو۔'' امی نے اصرار کیا۔

''جی ہے۔'' حبیب نے کہا۔

''کیا وجہ ہے؟'' امی نے پوچھا

''میں نہیں بتا سکتا امی۔'' حبیب نے کہا تو امی کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئیں۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ اسکول نہ جاؤ مگر ناشتہ تو کرلو۔''

''میں فریش ہوکر آتا ہوں۔'' حبیب نے کہا تو اس کی امی اثباتی انداز میں سر ہلاتی کمرے سے نکل کر صحن میں آگئیں جہاں کرسی پر بیٹھا حبیب کا چھوٹا بھائی جواد اسکول یونی فارم میں ملبوس حبیب کا انتظار کر رہا تھا۔ گھر کے دیگر افراد بھی وہیں موجود تھے۔

''کیا ہوا امی! آپ کیوں پریشان ہیں؟'' ان کی بڑی بیٹی حمنہ نے ماں کو پریشان دیکھا تو پوچھا۔ ''حبیب آج اسکول نہیں جا رہا۔''

''ہیں......'' حمنہ چونکی۔

''کیوں۔ کوئی وجہ بھی تو ہوگی۔'' حبیب کے دادا جان نے پوچھا۔

''پتا نہیں کیا وجہ ہے۔'' امی نے کہا۔
''بیٹی! آپ نے پوچھا نہیں حسیب سے۔'' حسیب کے دادا جان نے کہا۔
''پوچھا ہے مگر وہ وجہ نہیں بتا رہا۔'' امی نے بتایا۔''میں حسیب کی وجہ سے بے حد پریشان ہوں کیوں کہ وہ آئے دن اسکول سے چھٹی کر رہا ہے۔ آخر ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے جس سے حسیب پریشان ہے۔''
''ہوں......'' دادا جان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم پریشان نہ ہو۔ میں حسیب کو اسکول چھوڑ کر آتا ہوں اور حسیب سے بات کرتا ہوں۔''
پھر دادا جان، جواد کو اسکول چھوڑنے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حسیب نے ناشتا کرنے کے بعد کتابیں اٹھائیں اور پڑھنے کے لئے پارک میں چلا گیا۔ یہ پارک اس کے گھر کے قریب تھا۔
حسیب اور جواد دو بھائی تھے۔ ان کی ایک بہن تھی حمنہ۔ ان کے والد سعودی عرب میں روزگار کے سلسلے میں مقیم تھے۔
جب دادا جان، جواد کو اسکول چھوڑ کر گھر کی طرف آ رہے تھے تو انہوں نے حسیب کو پارک کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا اس لئے وہ گھر جانے کی بجائے پارک کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے پارک میں داخل ہو کر ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو انہیں حسیب ایک درخت کے سائے تلے بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ ایک کتاب کھولے اسے پڑھنے میں مگن تھا۔
پارک میں اکا دُکا افراد ہی موجود تھے مگر شام کو یہ پارک محلے کے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں سے بھر جاتا تھا۔ دادا جان، حسیب کی طرف بڑھ گئے۔ جب دادا جان، حسیب کے قریب بیٹھے تو حسیب نے بے اختیار چونک کر ان کی طرف دیکھا اور انہیں سلام کیا۔
''وعلیکم السلام۔ کیسے ہو حسیب بیٹا؟'' دادا جان نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہوں دادا جان۔'' حسیب نے کہا۔
''آج آپ اسکول کیوں نہیں گئے؟'' دادا جان نے چند لمحے خاموشی کے بعد کہا۔
''بس ویسے ہی دل نہیں چاہ رہا تھا۔''
دادا جان نے ہنکارا بھرا اور چند لمحے توقف کے بعد پھر بولے۔
''آپ نے دو روز قبل بھی اسکول سے چھٹی کی تھی اور آج بھی کی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ نے پچھلے مہینے بھی بغیر کوئی وجہ بتائے دو چھٹیاں کی تھیں۔''
حسیب خاموش رہا۔ اس کی نظریں کتاب پر جمی تھیں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
''حسیب بیٹا! کیا آپ کسی مسئلے میں گھرے ہوئے ہیں؟'' دادا جان حسیب سے مخاطب ہوئے۔
''نن۔ نہیں دادا جان۔'' حسیب نے گڑبڑا کر کہا مگر دادا جان نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا کہ حسیب کسی اہم مسئلے میں گھرا ہوا ہے جو وہ بتانا نہیں چاہ رہا یا بتانے سے ہچکچا رہا ہے۔ دادا جان بہ خوبی جانتے تھے کہ اگر انہوں نے حسیب کی رہنمائی نہ کی اور اس سے مسئلہ نہ پوچھا تو وہ مسئلے میں الجھتا چلا جائے گا اور ہو سکتا ہے وہ مایوس ہو جائے۔ دادا جان اسے مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ اس کی ڈھارس بندھانا چاہتے تھے۔
''حسیب بیٹا! میری طرف دیکھو۔'' دادا جان نے کہا تو حسیب نے ڈرتے ڈرتے دادا جان کی طرف دیکھا۔''تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کوئی اہم وجہ ہے...... جو بھی مسئلہ ہے مجھے بتاؤ تاکہ ہم دونوں مل کر اس کا حل تلاش کر سکیں۔''
حسیب سوچ میں پڑ گیا تاہم دادا جان کی بات سے اس کے دل کو تسلی ملی تھی اس لئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
''دادا جان...... وہ...... مجھے میتھ (ریاضی) سمجھ نہیں آ رہا کہ......'' دادا جان چونکے۔
''گویا اسکول سے چھٹی کرنے کی وجہ میتھ ہے۔'' دادا جان نے کہا۔
''جی دادا جان۔'' حسیب نے اعتراف میں سر ہلایا۔''آج میتھ کا ٹیسٹ تھا اور میں ٹیسٹ تیار نہ کر سکا تھا اسی لئے میں نے اسکول سے چھٹی کر لی ہے۔'' حسیب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔
''لیکن اسکول سے چھٹی کرنا مسئلے کا حل تو نہیں ہے۔'' دادا جان نے کہا۔''کیا آپ نے اپنے ٹیچر کو بتایا تھا کہ آپ کو میتھ سمجھ نہیں آتی؟''
''جی بتایا تھا۔ سر نے مجھے دو بار میتھ کے سوال سمجھائے

تھے۔'' حبیب نے جواب دیا۔

''جو سوال آپ کو نہیں آ رہے تھے کیا آپ نے انہیں بار بار حل کرنے کی کوشش کی؟''

''نہیں۔'' حبیب نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پھر آپ مایوس ہو گئے؟'' ''جی دادا جان۔''

''بس تو پھر غلطی آپ کی ہے۔'' دادا جان نے کہا۔ ''آپ کو جو سوال نہیں آ رہا تو آپ کو چاہئے کہ آپ اس سوال کو بار بار حل کرنے کی کوشش کریں اس سے آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آپ کو نہ صرف وہ سوال سمجھ آ جائے گا بلکہ مزید سوال حل کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔ اگر آپ ایک بار سوال حل کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں اور مایوس ہو گئے ہیں تو پھر آپ آگے کیسے بڑھ سکیں گے۔ لیکن میرا خیال ہے میتھ سمجھ نہ آنے کی وجہ ایک اور بھی ہے؟''

حبیب نے چونک کر دادا جان کی طرف دیکھا۔

''وہ کیا دادا جان؟''

''آپ کا رات دیر تک جاگنا اور وڈیو گیم کھیلنا۔'' دادا جان نے کہا۔ ''کیا میری بات درست ہے؟''

حبیب نے نظریں چُرا لیں۔ واقعی ایسا تھا۔ وہ رات دیر تک جاگتا رہتا تھا اور وڈیو گیم کھیلتا رہتا تھا۔ وہ وڈیو گیم ایک دوست سے لایا تھا۔ ''جی دادا جان......'' حبیب نے ایک بار پھر اعتراف کیا۔

''بس ساری وجہ یہی ہے کہ آپ رات دیر تک جاگتے رہتے ہیں اور وڈیو گیم کھیلتے رہتے ہیں۔ جب آپ اپنی پڑھائی سے توجہ ہٹائیں گے اور اپنا وقت فضول کاموں میں گزاریں گے تو پھر آپ کا رجحان پڑھائی کی طرف کیسے رہے گا۔'' دادا جان نے کہا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''اسی لئے آپ کی پریشانی کا حل یہی ہے کہ آپ رات دیر تک جاگنا اور وڈیو گیم کھیلنا چھوڑ کر اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دیں تو آپ کو کوئی سوال مشکل نہیں لگے گا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں دادا جان۔ میرے سوال نہ سمجھ آنے کی وجہ یہی ہے کہ میں نے اپنی توجہ پڑھائی سے ہٹا کر فضول کاموں پر لگا دی ہے۔'' حبیب نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''شکر ہے آپ کو بروقت سمجھ آ گئی۔'' دادا جان نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ ''اور ہاں...... مایوسی گناہ ہے۔ کوشش کرنے سے مایوسی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ آپ اللہ سے مدد مانگتے ہوئے اپنی کوشش جاری رکھیں تو اللہ آپ کی مدد ضرور کرے گا۔ آپ کو آئندہ کوئی سوال سمجھ نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لینا میں آپ کو سمجھا دیا کروں گا۔ بس آپ نے ہمت اور حوصلہ نہیں ہارنا۔''

اتنا کہہ کر دادا جان اٹھے اور گھر کی طرف چل دیئے جب کہ حبیب کی آنکھوں میں اُمید کے جگنو چمک اٹھے تھے۔ اس نے عہد کر لیا تھا کہ وہ آئندہ سے رات دیر تک نہیں جاگا کرے گا اور اپنا وقت فضول کاموں میں صرف کرنے کی بجائے اپنی پڑھائی پر دھیان دے گا جس سے اسے کامیابی ملنی تھی۔ ☆☆☆

مولانا ظفر علی خان

آزدی کی تحریک کے مجاہد مولانا ظفر علی خان 1873ء میں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی سراج الدین تھا۔ ان کے گاؤں کا نام کرم آباد ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ابتدائی تعلیم وزیر آباد سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان پٹیالہ سے پاس کیا۔ علی گڑھ یونی ورسٹی سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ مشہور مسلمان رہنما نواب محسن الملک کے سیکریٹری ہو گئے۔ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار ''زمیندار'' نے علم و ادب کی بہت خدمت کی۔ گھر کا ماحول اسلامی ہونے کی وجہ سے وہ نماز روزے کے بہت پابند تھے۔

مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے آپ نے بہت سی نظمیں اور مضامین تحریر کیے، آپ کو نعت گوئی میں بھی بہت کمال حاصل تھا۔ عشق رسول ﷺ کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کی مشہور زمانہ نعت کا ایک شعر

''دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تم ہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تم ہی تو ہو''

پاکستان بننے کے بعد کچھ عرصہ لاہور میں بھی رہے۔ گرمی کا موسم مری میں گزارتے تھے۔ یہ ان کی پسندیدہ جگہ تھی۔

زندگی کے آخری ایام میں آپ بہت زیادہ علیل ہو گئے۔ آخر 27 نومبر 1956ء کو آپ کرم آباد میں وفات پا گئے اور اپنے گھر کے پائیں باغ میں مدفون ہوئے۔ ایک سچے مسلمان، شاعر، صحافی اور ہم درد قومی رہنما کی حیثیت سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

(عبدالمغنی، بہاول پور)

مجھے بچوں سے پیار ہے۔ بچے ہوتے ہی ہیں پیار کے قابل۔ معصوم بھولے بھالے چہرے، روشن آنکھیں، نازک بدن...... جیسے بیلے کی کلیاں...... جیسے موم کی گڑیا۔ چھولیں تو پگھل جائیں اور ننھے ننھے دل اس سے بھی زیادہ نازک۔ ذرا غصے سے دیکھا، تھر تھر کانپنے لگے۔ زور سے ڈانٹا فوراً آنسو نکل آئے...... اور بچوں کو مارنا...... توبہ توبہ...... لے سانس بھی آہستہ آہستہ کہ نازک ہے بہت کام۔ لیکن اس کارگیر شیشہ گری میں لگتا ہے کہ کچھ بچے پتھر سے بنے ہوتے ہیں۔ آپ نے بھی دیکھے ہوں گے۔ میں بھی جب انہیں دیکھتا ہوں دل غم سے بھر جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے گاڑیوں کے شیشے صاف کرتے ہوئے بچے، دوڑ دوڑ کر بسوں میں پانی پلاتے ہوئے بچے، خون میں ڈوبی ہوئی سرخیوں والے اخبار بیچتے ہوئے بچے، ہاتھوں میں دالوں کے پیکٹ، پھولوں کے گجرے اٹھائے ہوئے، ننگے پیر، سر کو جھکائے، کندھے پر میلا سا تھیلا ڈالے، کچرا چنتے ہوئے، ہوٹلوں میں برتن دھوتے اور میزیں صاف کرتے اور ورک شاپ پر پہ ڈیزل اور گریس میں شرابور، استاد کی جھڑکیاں اور تھپڑ کھاتے ہوئے، قالین کی کھڈیوں پر بیگار کرتے ہوئے، زری کے کارخانوں میں ستارے ٹانکتے ہوئے یا بھٹوں پر اینٹیں ڈھونڈتے ہوئے بچے...... یہ سب بچے قوم کی گڑیا نہیں ہوتے۔ یہ پتھر کے مجسمے ہوتے ہیں۔ ان کے دل بھی پتھر کے ہوتے ہیں......؟ شاید نہیں......

میں جب بھی کسی ایسے بچے کو دیکھتا ہوں تو ایک کہانی میرے ذہن میں تخلیق پانے لگتی ہے۔ ''راجو محنت کش بچہ تھا۔ اس کا باپ فوت ہو چکا تھا۔ ماں ٹی بی کی مریض تھی...... چھوٹے چھوٹے بہن بھائی تھے۔ راجو کا دل چاہتا تھا کہ وہ پڑھے۔ اچھے اچھے کپڑے پہن کر اسکول جائے۔ کھیلے کودے مگر......'' میں جب بھی اس طرح سوچتا تو مجھے وہ ہزاروں کہانیاں یاد آجاتیں جو اس موضوع پر میں پڑھ چکا تھا اور جن کا انجام کسی نہ کسی طرح بچے کی موت یا مظلومی ہوتا تھا۔ خیال تو بہت آئے بھی مگر کہانی میں نہ ڈھل سکے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ بالآخر ایک دن میں نے کیمرے میں ریل ڈالی اور دفتر سے نکل کھڑا ہوا۔ سبزی منڈی قریب ہی تھی۔ سب سے پہلے یہاں گیا۔ بچے کمر پر ٹوکریاں لادے سامان منڈی سے کاروں کی ڈگی اور ریڑھوں پر منتقل کر رہے تھے۔ بہت سے دوسرے بچے کچرا چننے میں مصروف تھے۔ گندے مندے کپڑے...... میلے کچیلے چہرے...... سیاہ جیکٹ

ہاتھ پاؤں کچرے کے ڈھیر پر بیٹھے کچرے کا حصہ معلوم ہو رہے تھے میں انہیں دیکھتا ہوا، گھومتا پھرتا ایک رو سے دوسری رو میں جاتا رہا۔ ایک جگہ رش کچھ کم تھا۔ چند بچے بیٹھے مرچوں میں سے کچرا صاف کر رہے تھے۔ میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔ باتیں شروع ہوئیں۔ گل خان، نیک محمد، نور احمد...... سب راجو تھے۔ مرچوں سے ان کی آنکھیں اور ہاتھ جلتے تو گھر کا چولہا جلتا تھا۔ میں وہاں سے باہر آگیا، ٹوکری لادے ہر بچہ دراصل اپنی خواہشوں اور خاندان کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ سب ایک جیسی کہانیاں۔ میں روڈ کراس کر کے دوسری طرف آگیا...... ہوٹل کا کاکا اور ''استاد'' کا چھوٹے...... سب راجو تھے۔ میں مال روڈ کی طرف نکل گیا۔ چمچماتی گاڑیاں، زرق برق لباس، شیشوں والی دکانیں اور مہنگے مہنگے کپڑے میک اپ اور زیور سے لدی عورتیں اور صاف ستھرے صحت مند بچے۔ سبزی منڈی سے مال روڈ سڑک دو کلو میٹر اسٹیشن کا تین صدیوں کا فاصلہ ہے۔ میری موٹر سائیکل آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور ذہن تیزی سے اس تضاد پر سوچ رہا تھا۔ تضاد جو کائنات کے خمیر میں شامل ہے۔ خیر اور شر، حسن و قبح، ظالم و مظلوم، امیر و غریب...... ہر ایک، ایک دوسرے کی پہچان ہے۔ مال روڈ کے اس گلشن میں پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی تھے۔ مانگنے والے بچے...... کاریں صاف کرنے والے بچے۔ کاغذ اور کترنیں چننے والے بچے...... چلتے چلتے ایک کانٹے نے میرا دامن بھی تھام لیا...... ایک بارہ چودہ برس کا بچہ تھا...... ''پپو چاٹ کارنر'' کا مالک۔ مزے دار چاٹ کے چٹخارے لیتے میں نے پوچھا:

''کتنے بہن بھائی ہو؟''

''آٹھ!'' ''اچھا!'' ''تم سب سے بڑے ہو؟''

''جی!''

باتوں سے اندازہ ہوا...... وہ بھی راجو تھا۔

میں فوٹو گرافی کرتا شہر کے مختلف علاقوں میں چکراتا پھر رہا تھا اور بھوک کی وجہ سے تو مجھے بھی چکر آنے لگے تھے۔ گھوم گھوم کر پہیے بھی شاید تھک چکے تھے۔ ایک موڑ پر اچانک پچھلے پہیے کی ہمت جواب دے گئی۔ پھس...... سس...... س...... شاید پنکچر ہو گیا تھا۔ میں نے گاڑی روکی...... نظر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر پنکچر کی دکان موجود تھی...... بائیک کو گھسیٹتا ہوا وہاں تک لے گیا۔ چراغ کے جن کی طرح فوراً ایک ''کاکا'' حاضر ہو گیا۔ ٹائر اتارتے ہوئے بچے سے میں نے پوچھا۔

''پڑھتے ہو؟''

''جی چھوڑ دیا۔'' تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''کتنے بہن بھائی ہو؟'' ''چار۔''

''چوتھی روٹی نہیں پکتی ہوگی؟'' میں نے ٹی وی کے اشتہار کو ذہن میں لاتے ہوئے کہا۔ بچہ سمجھ دار تھا۔ اشارہ سمجھ گیا۔

''جی نہیں...... صرف کھانے کے لیے تو جانور جیتے ہیں...... میں تو اپنے بھائی کو پڑھانے کے لیے مزدوری کرتا ہوں...... میں اسے بابو بناؤں گا۔''

بہت عرصہ بیتا۔ شاید بیس سال۔ یہی جملہ میں نے سنا تھا۔

''میں اپنے بھائی کو بابو بناؤں گا۔ میرے بڑے بھائی تھے۔ عثمان جنھوں نے چھٹی جماعت سے پڑھنا چھوڑ دیا۔ سائیکل مرمت کی دکان پر مزدوری شروع کر دی تھی۔ وہ اتنے چھوٹے تھے کہ ٹائر میں ہوا بھرنے کے لیے انہیں پمپ کے اوپر لٹکنا پڑتا تھا۔ وہ ہوا بھرتے پنکچر لگاتے...... سائیکلیں مرمت کرتے رہے...... میں پڑھتا رہا۔ اس کے ہاتھ اور کپڑے میلے ہوتے...... میں بن ٹھن کر اسکول جاتا...... وقت پر لگا کر اُڑتا رہا...... آج میں ضلع کے اکاؤنٹ آفس میں بڑا افسر ہوں۔ گلبرگ کے مہنگے فلیٹ میں رہتا ہوں۔ عثمان بھائی پنکچر لگاتے ہیں۔

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ بچہ کام ختم کر چکا تھا۔ اس کے چہرے پر اعتماد اور آنکھوں میں اُمید کے ستارے روشن تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ ستارے چمکتے رہیں گے۔ میں آگے بڑھا اور بے اختیار اس کے میلے ہاتھوں کو چوم لیا۔ عثمان بھائی! میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ بچہ حیران تھا۔ میں اسے حیرت زدہ چھوڑ کر آگے روانہ ہو گیا۔

میرا رخ شاہدرہ کی بستی کی طرف تھا جہاں عثمان بھائی کا گھر اور سائیکلوں کی چھوٹی سی دکان ہے...... مجھے احساس ہوا کہ میں پچھلے دو ماہ سے ان کے گھر میں نہیں جا سکا تھا۔

☆☆☆

جج (چور سے): ''دروازے پر پیروں کے نشان سے پتا چلتا ہے کہ تم نے کمرے کے اندر گھس کر چوری کی۔''
چور (غصے سے): ''یہ غلط ہے۔ میں تو کھڑکی کے راستے اندر گیا تھا۔''
(میمونہ تنویر، منڈی بہاؤ الدین)

☆☆☆

استاد: ''لڑکو! اگر میز پر تین مکھیاں بیٹھی ہوں اور ان میں سے ایک میں مار ڈالوں تو باقی کتنی بچیں گی؟''
عقل مند لڑکا: ''صرف ایک مکھی۔''
استاد: ''وہ کیسے؟''
لڑکا: ''باقی مکھیاں اڑ جائیں گی اور مردہ مکھی رہ جائے گی۔''
(یوسف خالد، لاہور)

☆☆☆

استاد: ''آریہ لوگ ہندوستان میں کیسے آئے؟''
طالب علم: ''اس وقت ہوائی جہاز، موٹر اور ریل وغیرہ نہیں تھی۔ اس لیے پیدل ہی آئے ہوں گے۔''
(عمر بشیر، گوجرانوالہ)

☆☆☆

جغرافیہ کا ماسٹر (لڑکے سے) ''نمک کہاں سے آتا ہے؟''
لڑکا: ''جناب، رامو پنساری کی دکان سے۔''
(سرور محمود، کراچی)

☆☆☆

قصاب (بیوی سے): ''سامنے والے دکان دار سے آٹا مت خریدنا۔''
بیوی: ''کیوں؟''
قصاب: ''کیوں کہ وہ میرے باٹ لے گیا ہے۔''

☆☆☆

استاد: ''آسمان کیا ہے؟''
لڑکا: ''اسم۔''
استاد: ''کون سا اسم ہے؟''
لڑکا: ''اسم بعید۔''
استاد (چپت لگا کر): ''کس طرح؟''
لڑکا: ''بہت دور جو ہے۔''
(بختاور قمر، رحیم یار خان)

☆☆☆

باپ: ''بیٹا! پانچ اور پانچ کتنے ہوئے؟''
بیٹا: ''دس۔''
باپ: ''شاباش! لو یہ دس روپے انعام۔''
بیٹا (منہ بسور کر): ''مجھے خبر ہوتی تو بیس بتاتا۔''
(ساجد خان، اٹک)

☆☆☆

استاد (مانیٹر سے): ''تمہارا ہاتھ سوجا ہوا ہے۔ کہیں چوٹ لگی ہے؟''
مانیٹر: ''جناب، رشید کو تھپڑ مارا تھا۔''
(زین العابدین، قصور)

☆☆☆

محرر چونگی (ٹوکرے کو ٹھوکر مار کر): ''اس میں کیا ہے؟''
چوڑیاں بیچنے والا: ''پہلے تو چوڑیاں تھیں مگر اب کچھ بھی نہیں۔''

☆☆☆

داروغہ (کسان سے): ''کیا تمہارے گاؤں کو آگ لگ گئی تھی؟''
کسان: ''جی حضور۔ سارا گاؤں جل کر خاک ہو گیا۔''
داروغہ: ''کچھ بچا بھی؟''
کسان: ''صرف آگ بجھانے والی موٹر۔ کیوں کہ وہ دیر میں آئی تھی۔''
(ایمن شیروانی، اسلام آباد)

☆☆☆

سلیم: ''کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ بچے انڈوں میں سے نکل آتے ہیں۔''
افتخار: ''مگر اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ بچے انڈوں میں گھس کیسے جاتے ہیں!''
(نعمان رفیق، پشاور)

☆☆☆

استاد: ''تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟''
سعید: ''جناب! میرے اوپر سے ریل گزر گئی تھی۔''
استاد: ''ارے! تم زندہ کس طرح رہے؟''
سعید: ''جناب، میں پل کے نیچے تھا۔''
(وقاص آصف، سرگودھا)

اگر کسی خوش مزاج، ایمان دار اور عاجزی اور انکساری کے پیکر کرکٹر کی تلاش کی جائے تو جو نام سامنے آئے گا وہ یقیناً یونس خان ہو گا۔ وہ بیٹنگ کے سلطان بنے، کئی ریکارڈز توڑے۔ یونس خان کریز پر آتا تھا تو مایوسیاں امید بن کر خوشیوں میں بدل جاتی تھیں۔ انہوں نے کئی بار ٹیم کو بحرانوں سے نکال کر جیت سے ہم کنار کیا۔ یونس خان کو مردِ بحران ایسے ہی نہیں کہا جاتا۔ 2009ء میں ٹیم کو ٹی ٹوئنٹی چیمپئن بنوایا۔ کرکٹ کی ہر ٹیسٹ ٹیم کے خلاف سنچری کا عالمی ریکارڈ بنایا۔ پاکستان کی طرف سے سب سے زیادہ سنچریاں، سب سے زیادہ رنز اور ٹرپل سنچری بھی بنائی۔ ہوم گراؤنڈ ہو یا پرایا ملک یونس کا بلا ہر جگہ چلتا رہا۔ مختصر یہ کہ یونس خان کے کارناموں کی سترہ سالہ داستان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

یونس خان 29 نومبر 1977ء کو مردان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ پھر فیملی کے ساتھ کراچی منتقل ہو گئے۔ کرکٹ کے شوق نے آہستہ آہستہ ان کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا۔ انہوں نے 26 فروری 2000ء کو سری لنکا کے خلاف ٹیسٹ ڈیبیو کیا۔ انہوں نے اپنے پہلے ٹیسٹ میچ میں سری لنکا کے خلاف شان دار سنچری اسکور کر کے اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔ جب کہ ایک روزہ کرکٹ کا آغاز انہوں نے فروری 2000ء میں سری لنکا کے خلاف ہی کیا۔

''ہر کھلاڑی کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے۔ جب وہ اپنے جنون سے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور میرا وقت بھی آ گیا ہے۔ اس لیے ویسٹ انڈیز کا دورہ میرا آخری ٹورنامنٹ ہو گا۔ اس کے بعد وہ بین الاقوامی کرکٹ سے ریٹائرڈ ہو جائیں گے۔'' یونس خان نے ویسٹ انڈیز کے دورے سے پہلے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ ''میں نے ہمیشہ پاکستان کے لیے کھیلنے کی کوشش کی اور یہی سوچا کہ کھیل کے دوران میرا سر فخر سے بلند رہے۔''

یونس خان کی کرکٹ تربیت کا باقاعدہ آغاز ملیر جم خانہ کلب سے ہوا۔ جہاں راشد لطیف اور سعید انور نے ان کی صلاحیتوں پر انہیں بہترین رہ نمائی فراہم کی۔ 99-1998ء میں انہوں نے فرسٹ کلاس کرکٹ میں قدم رکھا اور ابتدائی ڈومیسٹک سیزن میں بہترین کارکردگی نے ان پر بین الاقوامی کرکٹ کے دروازے کھول دیے اور یوں 26 فروری 2000ء کو اپنا پہلا ٹیسٹ کھیلنے میں کام یاب ہو گئے۔ 40 سال کے قریب ہونے کے باوجود ان کا فٹنس لیول یہ ہے کہ آج بھی وہ چاق و چوبند اور پھرتیلے نظر آتے ہیں۔

یونس خان کے کرکٹ کیریئر میں کئی نشیب و فراز آئے۔ تاہم وہ ہر رکاوٹ، مشکل اور تکلیف کا مردانہ وار مقابلہ کر کے آگے بڑھتے رہے۔ ستمبر 2014ء میں انہیں اس وقت شدید دھچکا لگا۔ جب آسٹریلیا کے خلاف متحدہ عرب امارات میں ہونے والے ایک روزہ اور ٹی ٹوئنٹی مقابلوں کے لیے ان کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ وہ اس وقت شدید مایوس تھے اور انہوں نے کم و بیش ٹیسٹ کرکٹ ریٹائرمنٹ کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تاہم بعد میں انہوں نے اپنا فیصلہ تبدیل کیا۔ جو نہ صرف ان کے لیے خوش بختی کی علامت بن کر آیا۔ بلکہ آج جو ریکارڈز یونس خان کے پاس ہیں۔ شاید وہ خود اور ہر پاکستانی انہیں فراموش نہ کر سکیں۔ آسٹریلیا کے خلاف دو ٹیسٹ میچوں کی سیریز میں یونس خان نے 156 کی اوسط سے 468 رنز بنائے اور مین آف دی میچ سیریز رہے۔ یوں اپنی غیر معمولی کارکردگی سے انہوں نے پاکستان کرکٹ بورڈ کے فیصلہ سازوں کو نہ صرف شرمندہ کیا بلکہ اپنی اہمیت تسلیم کرنے پر بھی مجبور کر دیا۔

یونس خان اپنے کرکٹ کیریئر میں پاکستانی ٹیم کے علاوہ ناٹنگھم شائر، یارکشائر، راجھستان رائلز، ساؤتھ آسٹریلیا، پشاور پینتھر، ایبٹ

آباد فالکنز اور حبیب بینک کی نمائندگی کرتے بھی نظر آئے۔

ان تمام تر ناقابلِ یقین ریکارڈز اور کامرانیوں کے باوجود وہ اپنی فیملی کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر بھی دل گرفتہ رہے۔ ان پے در پے مصائب و مشکلات کے باوجود پاکستان کے لیے ان کے عزم اور ارادوں میں تبدیلی نہ آئی۔ انہوں نے فیملی سانحات اور واقعات کو ہمت، حوصلے اور صبر سے برداشت کیا بلکہ ملک کے لیے اپنی خدمات احسن طریقے سے ادا کرتے رہے۔ وہ سابق پاکستانی کوچ آنجہانی باب وولمر کا نام بھی احترام سے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی صلاحیتوں اور کارکردگی میں اضافے میں باب وولمر کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔

یونس خان کرکٹ کے علاوہ مچھلی کے شکار کا شوق رکھتے ہیں اور اکثر کرکٹ سے فراغت کے بعد مچھلی کا شکار کرتے نظر آتے ہیں۔

یونس خان کے مختلف ریکارڈز

☆ یونس خان ٹیسٹ کرکٹ میں پاکستان کی جانب سے سب سے زیادہ رنز بنانے والے بلے باز ہیں۔ وہ پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے دس ہزار رنز کا سنگِ میل عبور کیا۔ یوں وہ تاریخی بلے باز بن گئے۔

☆ جنوری 2017ء میں سڈنی ٹیسٹ میں یونس خان نے اس وقت تاریخ رقم کر دی جب انہوں نے آسٹریلیا کے خلاف چونتیسویں (34) سنچری اسکور کی۔ یوں وہ دنیا بھر میں گیارہ مختلف ملکوں میں سنچری بنانے والے دنیا کے واحد بلے باز بن گئے۔ ان سے قبل یہ ریکارڈ بھارت کے راہول ڈریوڈ کے پاس تھا۔ جنہیں دس ملکوں کے خلاف سنچری بنانے کا اعزاز حاصل تھا۔ ان گیارہ ملکوں میں دس ٹیسٹ کھیلنے والے ممالک اور گیارہواں نیوٹرل وینیو (متحدہ عرب امارات) شامل ہیں۔

☆ یونس خان تیسرے پاکستانی بلے باز ہیں۔ جنہوں نے ٹیسٹ کرکٹ میں ٹرپل سنچری (313 رنز) بنائی۔ انہوں نے یہ اعزاز 2009ء میں سری لنکا کے خلاف کراچی میں حاصل کیا۔ ان سے قبل حنیف محمد (337 رنز) کے ساتھ پہلے جب کہ انضمام الحق (329 رنز) کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہیں۔ جب کہ ویسٹ انڈیز کے خلاف گزشتہ سال اظہر علی نے بھی 302 رنز کی انفرادی اننگز کھیلی۔

☆ یونس خان کا سب سے بڑا کارنامہ بلاشبہ اپنی قیادت میں پاکستان کو 2009ء کا ٹی ٹوئنٹی کرکٹ کا عالمی چیمپئن بنوانا تھا۔ یہ جیت 1992ء کے ورلڈ کپ کے بعد پاکستان کرکٹ کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

☆ پاکستان کی جانب سے ٹیسٹ کرکٹ میں 6 مرتبہ ڈبل سنچری بنانے والے دوسرے بلے باز ہیں۔ ان سے پہلے یہ اعزاز جاوید میانداد کے پاس تھا۔ جنہوں نے مختلف ممالک کے خلاف 6 ڈبل سنچریاں ہی اسکور کر رکھی تھیں۔ گزشتہ سال دورۂ انگلینڈ کے دوران یونس خان نے اپنی آخری ڈبل سنچری اسکور کی۔

☆ ٹیسٹ کرکٹ میں پاکستان کی طرف سے سب سے زیادہ چونتیس (34) سنچریوں کا اعزاز بھی یونس خان کے پاس ہے۔

☆ یونس خان ان چند پاکستانیوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے پہلے ہی ٹیسٹ میچ میں سنچری اسکور کی۔

☆ یونس خان کا نام حال ہی میں وزڈن بک 2016ء میں سال کے پانچ بہترین کھلاڑیوں میں شامل کیا گیا۔

☆ یونس خان دنیا کے 13ویں بلے باز ہیں، جنہوں نے دس ہزار رنز کا سنگِ میل عبور کیا۔

☆ یونس خان سو سے زائد ٹیسٹ میچز کھیلنے والے پانچویں پاکستانی ہیں۔

☆ ٹیسٹ میچز میں کیچز کی سنچری مکمل کرنے والے وہ واحد پاکستانی فیلڈر ہیں۔

☆ 25-1924ء میں ہربرٹ اسٹکاف کے کارنامے کے بعد یونس خان دوسرے بین الاقوامی کرکٹر ہیں جنہوں نے آسٹریلیا کے خلاف مسلسل تین سنچریاں اسکور کیں۔

☆ سری لنکا کے خلاف 6 جولائی 2015ء کو تیسرے ٹیسٹ میچ کی چوتھی اننگز میں جب انہوں نے سنچری اسکور کی تو وہ ٹیسٹ کی چوتھی اننگز میں پانچویں مرتبہ سنچری کا کارنامہ انجام دینے والے واحد کرکٹر بنے۔

☆☆☆

آؤ محبتیں بانٹیں

فریدہ گوہر

دادی اماں ٹی وی لاؤنج میں سب بچوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ثناء اور عائشہ ایک طرف بیٹھی میتھ کا ہوم ورک کر رہی تھیں۔ آپی صبا ان کی نگرانی پر مامور تھیں۔ ساتھ ہی وہ اپنا پاکستان اسٹڈی کا ٹیسٹ بھی یاد کر رہی تھیں۔ عمران اور عثمان انگلش کا ہوم ورک کر رہے تھے۔ ننھا شعیب ڈرائنگ کر رہا تھا۔ دادی اماں پھپھو سے باتیں بھی کر رہی تھیں اور ساتھ حنا کو اُردو املا لکھوا رہی تھیں۔ ٹی وی بند پڑا تھا۔ دادی اماں کی تیز نگاہ سب کو اپنے اپنے کاموں میں مصروف رکھے ہوئے تھی کہ حبا کے رونے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی مما اس کا بازو پکڑے گھسیٹتی ہوئیں ٹی وی لاؤنج میں لائیں اور دادی اماں کے تخت کے پاس اسے تقریباً پٹخ ہی تو دیا۔

''ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ پھپھو نے حبا کی مما کو کہا اور حبا کو اپنے پاس بٹھا کر اس کے آنسو صاف کرنے لگیں۔''

''محترمہ کچن میں گلاس توڑ کر آئی ہیں۔'' مما سخت غصے میں تھیں۔ ''ایک پل بھی جو چین سے بیٹھے۔'' مما کو شدید غصہ آیا ہوا تھا۔ پھپھو حبا کو چمکار رہی تھیں۔ بچوں نے ذرا کی ذرا سر اٹھایا، حبا کو زور زور سے روتے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

''ہاں بہو! یہ تمہیں بہت تنگ کرنے لگی ہے۔'' دادی اماں نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے کہا۔

''اماں! اب رہنے دیں اتنی پیاری تو بچی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ صرف ساڑھے تین سال کی ہی تو ہے۔''

پھپھو نے اس کی طرف داری کی۔ حبا پھپھو کی گود میں بیٹھ گئی۔ پھپھو نے اس کے آنسو صاف کیے اور اس کے گال پر چٹ چٹ پیار کر ڈالا۔ حبا مما کی ڈانٹ بھول گئی۔

''پھپھو میں کس کے ساتھ کھیلوں میرا کوئی دوست نہیں۔'' حبا نے منہ بنا کر کہا۔

''ارے ہم سب تمہارے دوست ہی تو ہیں۔'' پھپھو نے کہا۔

''نہیں! میرا کوئی دوست نہیں ہے۔'' حبا نے زور سے سر ہلایا کہ اس کی پونی ہلنے لگی۔

''ثناء عائشہ تو آپ سے تھوڑی سی بڑی ہیں، ان سے دوستی کیوں نہیں ہے تمہاری۔'' پھپھو نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ دونوں صبح اسکول چلی جاتی ہیں اور شام کو دادی اماں کے

پاس آ کر ہوم ورک کرتی ہیں۔ میرے ساتھ نہیں کھیلتیں۔'' حبا نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''اور آپی صبا۔'' پھپھو نے آپی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''وہ سب کو ڈانٹتی رہتی ہیں۔ انہیں کھیلنے کے لیے کہو تو وہ کہتی ہیں جاؤ خود کھیلو۔ بھلا کوئی خود اکیلا بھی کھیل سکتا ہے۔ حبا کے جواب پر پھپھو مسکرا دیں۔

''تو پھر عمران، عثمان اور شعیب کو دوست بنا لو۔'' پھپھو نے اسے مشورہ دیا۔

''وہ میری پونی کھینچتے ہیں۔ مجھے درد ہوتی ہے۔ بال زور سے پھینکتے ہیں۔ میں اٹھا نہیں سکتی۔ زور سے بھاگتے ہیں، میں ایسے نہیں بھاگ سکتی۔ پھپھو میرا بستہ بھی نہیں ہے۔ میری نظموں کی کتاب بھی نہیں ہے۔ میں کیا کروں، ڈرائنگ بک بھی نہیں ہے۔ میں ان کی ڈرائنگ بک پر کام کرتی ہوں تو یہ مجھے ڈانٹ دیتے ہیں۔'' حبا نے معصومیت سے کہا۔

''حبا آپ اسے دوست بنا لو لیں۔'' دادی اماں نے پاس لیٹے چھ ماہ کے عثمان کی طرف اشارہ کیا۔

''عثمان گندا ہے، ہر وقت روتا ہے یا دودھ پیتا ہے۔ میرے ساتھ نہیں کھیلتا۔'' حبا نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مما اس سے پیار کرتی ہیں مجھ سے نہیں۔'' حبا نے کہا۔ سب بچے حبا کی دکھی باتیں سن رہے تھے۔ سب کے کام کرتے ہوئے ہاتھ رک گئے تھے۔ دادی اماں نے ننھی حبا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میں حبا کی دوست بنوں گی۔ کل ہی میں اسے ایک پیارا سا اسکول بیگ منگوا کر دوں گی۔ ثناء اور عائشہ نے جلدی سے اپنے اپنے بیگز سے بچوں کی نظموں کی کتابیں نکال کر حبا کو دیں۔

''حبا آپ یہ کتابیں لے لو ہم یہ کتابیں پڑھ چکے ہیں۔ کل جو اسکول بیگ دادی اماں آپ کو لے کر دیں گی اس میں رکھنا اور ہم دونوں تمہیں یہ نظمیں پڑھنا سکھائیں گے پھر تو آپ ہماری دوست بن جاؤ گی ناں۔''

حبا خوش ہو گئی، وہ کتابوں کو کھول کر ایک ایک صفحہ دیکھنے لگی۔

''آپ میری پنسل لے لو۔'' عمران نے کہا۔

''یہ میرا ربڑ آپ رکھ لیں۔'' عثمان نے کہا۔

شعیب نے اپنی کلر پنسلوں کا ڈبہ حبا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ حبا! تم میری دوست بن جاؤ میں آپ کو رنگ بھرنا سکھاؤں گا۔''

یوں سب حبا کے دوست بن گئے۔ اب حبا بے چینی سے انتظار کرتی کہ کب سب بچے اسکول سے واپس آتے ہیں اور کب وہ ٹی وی لاؤنج میں دادی اماں کے ساتھ اچھا سا وقت گزارتے ہیں۔ اب حبا کو کسی بات کی شرمندگی نہیں ہوتی، وہ دادی اماں کے پاس بیٹھ کر اپنا ننھا سا بیگ کھولتی اور اپنی مرضی کا کام کرتی اور اپنے کاموں کے ساتھ ساتھ سبھی بچے اسے کچھ نہ کچھ سکھا رہے ہوتے۔ یوں اس کا چڑچڑا پن ختم ہو گیا۔ اب اسے کوئی شکایت نہیں تھی کہ اس کا دوست نہیں۔ وہ اپنے بہن بھائیوں کے لیے بہت سے کام بھی کرنے لگی تھی۔

ایک دن وہ ٹی وی لاؤنج میں آئی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ حیران ہوئی۔ تھوڑی دیر بیٹھی انتظار کرتی رہی اور جب کوئی نہ آیا تو وہ ان کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ سب بچے کچن میں موجود تھے۔ اس کے وہاں آنے پر سب بچوں نے کھسر پھسر شروع کر دی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ دادی اماں اسے لے کر لان میں آ گئیں۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ کچھ دیر بعد خود دادی اماں نے کہا کہ حبا آؤ ٹی وی لاؤنج میں چلتے ہیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئے۔

''سرپرائز۔'' سب بچوں نے ایک آواز میں کہا اور حبا حیران میز پر سجے کیک کو دیکھ رہی تھی، مما نے اسے گلے لگایا۔

''حبا آج آپ کی سال گرہ ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''آج آپ چار سال کی ہو گئی ہیں۔'' دادی اماں نے کہا۔

''ایک سال بعد تم اسکول جانے لگو گی۔'' پھپھو نے کہا۔

''حبا یہ کیک میں نے بنایا ہے۔'' آپی صبا نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر کہا۔

''حبا یہ لو تمہارے لیے تحفہ۔'' سب بچوں نے اسے ایک ایک پیکٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔

حبا اس دن بہت خوش تھی، خوش کیوں نہ ہوتی۔ سب اس کے دوست تھے۔ اس سے پیار کرتے تھے۔ اب وہ بھی ان کی اچھی دوست تھی۔ مسکراتی ہوئی ہنستی ہوئی خوشی، سے بھرپور، ہر وقت ان کی مدد کرنے کو تیار۔

☆☆☆

انسان اور جانور

مدینہ نور۔ سیالکوٹ

سیلاب نے ہر چیز اجاڑ کر رکھ دی تھی۔ ہر طرف درخت گرے پڑے تھے۔ فصلیں خراب ہو چکی تھیں۔ گھر منہدم ہو چکے تھے۔ دینو کے باغ میں موجود پیڑ اور فصلیں بالکل ناکارہ ہو چکی تھیں۔ پانی اس کا گھر بھی بہا لے گیا تھا۔ وہ کھلے آسمان تلے اپنے چار بچوں اور بیوی کو لیے پھٹی پھٹی نگاہوں سے سب دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

دینو کے باغ میں موجود درختوں پر کئی پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے جن میں طوطا، مینا، چڑیا اور بلبل شامل تھے۔ درخت گر جانے کے باعث ان کے گھونسلے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ سب پرندے باغ کی آدھی بچ جانے والی دیوار پر خاموش بیٹھے تھے۔ مینا نے سسکی بھری۔ طوطا بولا۔ ''اب کیا ہوگا۔'' بلبل کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ چڑیا اپنے دو دن پہلے انڈوں سے نکلنے والے بچوں کو سمیٹتے ہوئے بولی: ''میں ان کو لے کر کہاں جاؤں گی۔''

☆☆☆

امدادی ٹیمیں پہنچ چکی تھیں۔ دینو بھی اپنے بچوں کے ساتھ امدادی کیمپ میں چلا گیا۔ ہر طرف آہ و بکا تھی۔ دینو کو ایک خیمے کی طرف جانے کو کہا گیا۔ سب خیمے بھرے ہوئے تھے۔ ہزاروں لوگ تھے جن کو خیمے مل چکے تھے اور لاکھوں تھے جو اب بھی بے سرو سامان تھے۔ دینو کو ایک خیمہ دیا گیا۔ وہ اس طرف گیا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ اس خیمے کے باہر جمع ہیں۔ شاید یہ آخری خالی خیمہ ہے اس لیے بہت سے لوگ اس خیمے کے باہر جمع ہیں۔ دینو نے دل میں سوچا کہ پتا نہیں یہ مجھے مل پائے گا کہ نہیں۔ مگر مجھے تو اسی خیمے میں جانے کے لیے کہا گیا ہے۔ اگر کوئی ضرورت مند ہوا جس کو خیمہ نہ ملا ہوا تو میں اس کو بھی اپنے ساتھ رکھ لوں گا۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ مگر...... پتا نہیں کیا ہوتا ہے۔ دینو انہیں سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ پتا چلا کہ علاقے کے ڈی۔ سی۔ او کے دور کے رشتہ دار بھی کسی ایسے گاؤں میں رہتے ہیں جہاں سیلاب آیا ہے۔ وہ لوگ ابھی یہاں پر پہنچے بھی نہیں مگر ڈی۔ سی۔ او نے یہ خیمہ ان کے لیے پہلے ہی بک کروا لیا ہے تاکہ جب وہ آئیں تو انہیں کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے مگر باقی لوگوں کی تکلیف کا کیا ہوگا یہ وہ نہیں جانتے تھے۔

☆☆☆

وہ سب ابھی پریشان ہی بیٹھے تھے کہ ایک چیل ان کے پاس آئی اور ان کو کہا کہ وہ سب گاؤں کے اس پار والے جنگل میں آجائیں۔ وہاں پر سیلاب سے متاثر ہونے والے پرندوں کے لیے چند گھونسلوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ پرندوں کے لیے اپنا آشیانہ چھوڑنا مشکل تھا مگر کسی آسرے کی تلاش ان کو بھی تھی۔ وہ اس کے پیچھے چل پڑے۔ چڑیا کے بچے چھوٹے تھے۔ وہ اڑ نہیں سکتے تھے۔ چیل نے ان کو اپنی کمر پر سوار کیا اور چل دی۔ وہاں پر پہنچے تو دیکھا کہ کئی پرندے روتے دھوتے وہاں موجود تھے۔ گھونسلے تھوڑے تھے اور پرندے زیادہ۔

سردار چیل نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جن پرندوں کے بچے چھوٹے ہیں ان کو گھونسلے دیے جائیں گے تاکہ ان کے بچے بچ جائیں اور اگر وہ اپنے ساتھ کسی اور پرندے کو بھی اپنے گھونسلے میں رکھ سکتے ہیں تو اجازت ہے۔ ہم سب کو مل کر کام کرنا ہوگا تاکہ اس مصیبت سے نمٹا جا سکے۔ کچھ پرندوں کو اس بات پر اعتراض بھی تھا مگر چیل کے آگے کس کی چلتی تھی۔ چڑیا اپنے بچوں کو لیے ایک گھونسلے میں بیٹھ گئی۔ اس نے طوطے کو بھی اپنے گھونسلے میں جگہ دے دی۔ اس طرح جب سب بچوں والے پرندے گھونسلوں میں آگئے اور اپنے دوستوں کو بھی جگہ دے دی تو اور بھی کئی گھونسلے باقی بچ گئے۔ جو رہ جانے والے پرندوں میں بانٹ دیے گئے۔ مینا اور بلبل بھی ایک گھونسلے میں آگئیں۔ سب خوش ہوگئے۔ کچھ دیر پہلے کسم پرسی والی حالت اب خوش گوار ریت میں تبدیل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ادھر دینو نے کافی انتظار کیا مگر اس کو کوئی خیمہ نہ دیا گیا۔ ایک خیمہ جو ڈی۔ سی۔ او کے رشتہ داروں کو دے دیا گیا۔ دینو نے

اپنے ننھے آنسو بہاتے بچے کو بازوؤں میں بھینچتے ہوئے سوچا اور مایوسی سے آنکھیں موند لیں۔ ☆☆☆

دونوں جان دار سیلاب ہی سے متاثر ہوئے تھے اور ایک اشرف المخلوقات ہونے اور عقل ہونے کے باوجود بے چینی اور مایوسی پھیلا رہا تھا جب کہ دوسرا ایک پرندہ ہونے کے باوجود سکون فراہم کر رہا تھا۔ کیوں کہ چڑیا کے بچے اس کے پروں میں سر دیے سکون سے سو رہے تھے جب کہ دینو کے بچے نیند میں بھی سسک رہے تھے۔

پہلا انعام: 175 روپے کی کتب

فالسے والا

معتصم الٰہی، شیخوپورہ

جون کا مہینہ، گرمی کا موسم تھا۔ گرمی بھی اپنے عروج پہ تھی۔ اسکول سے گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ وہ اکثر ہماری سنسان گلی میں فالسہ بیچنے آتا تھا۔ آج بھی وہ حسبِ معمول کبھی گلی کے اس کونے پر اور کبھی اس کونے پر ہاتھ والی ریڑھی کو مشکل سے دھکیلتے ہوئے پسینے میں شرابور آواز لگا رہا تھا: ''فالسہ ٹھنڈا، میٹھا فالسہ۔''

میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ گھر کے باہر بیٹھا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک آدمی جو کافی پُر وقار اور نہایت شریف معلوم ہو رہا تھا فالسے والے کے پاس آکر رکا اور اپنی موٹر سائیکل سے اترا۔ پھر ان دونوں میں ایک مکالمہ شروع ہو گیا:

آدمی: ''ایک پاؤ فالسہ کتنے کا ہے؟''

فالسے والا: ''جناب 20 روپے پاؤ ہے۔''

آدمی: ''ایک پاؤ دے دو۔''

فالسے والا: ''جی ابھی دیتا ہوں۔''

آدمی: ''آپ کے کتنے بچے ہیں۔''

فالسے والا: ''جناب تین۔''

آدمی: ''بچے اسکول پڑھتے ہیں؟''

فالسے والا: ''جی جناب صرف بڑا بچہ پڑھتا ہے۔''

آدمی: ''کتنے روپے روزانہ کما لیتے ہو؟''

فالسے والا: ''جناب تین سو کما لیتا ہوں جس میں سے پچاس روپے ریڑھی کا کرایہ دیتا ہوں اور 250 روپے مجھے گھر کے لیے بچ جاتے ہیں۔''

آدمی (کچھ دیر سوچنے کے بعد) اتنی مہنگائی میں اتنے تھوڑے پیسوں سے گزر بسر تو مشکل سے ہوتا ہوگا؟

فالسے والا: اللہ کا شکر ہے جی! جیسا بھی ہے گزارہ کر رہے ہیں۔

آدمی: ''تم یہ ریڑھی کیوں نہیں خرید لیتے؟ اس سے تمہیں وہ پچاس روپے بھی بچ جائیں گے جو تم کرایہ دیتے ہو۔''

فالسے والا: ''جی تین ہزار کی ریڑھی ملتی ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔''

وہ کچھ سوچنے لگا اور اپنی جیب سے ہزار ہزار کے تین نوٹ نکال کر فالسے والے کی طرف بڑھا دیے۔

فالسے والا: ''میں یہ پیسے نہیں لوں گا۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کسی سے یوں پیسے لینا۔''

آدمی: ''اُدھار دے رہا ہوں اس سے ریڑھی خرید لینا۔''

ساتھ ہی آدمی نے اپنی جیب سے کاغذ اور پینسل نکال کر کاغذ پر کچھ لکھا اور کہا:

''اس پرچی پر میرا پتا لکھا ہے۔ تھوڑے روپے جمع کر کے لوٹا دینا۔'' پھر پرچی اور پیسے فالسے والے کی طرف دوبارہ بڑھا دیے۔ اب فالسے والے نے مشکور نگاہوں سے آدمی کو دیکھا اور پھر پیسے اور پرچی پکڑ لی۔

آدمی وہاں سے چلا گیا۔ فالسے والے نے مجھے آواز دی اور پرچی پکڑا کر کہا کہ بیٹا دیکھو کہاں کا پتا لکھا ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پرچی پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ صرف فالسے والے کی تسلی کے لیے لائنیں لگائی گئی تھیں۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ شعر گردش کرنے لگا۔

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

دوسرا انعام: 195 روپے کی کتب

مکافاتِ عمل

سیدہ بینش زہرہ، لاہور

''فاطمہ! تم نے ابھی تک برتن نہیں دھوئے۔ جس طرح کالی کلوٹی تمہاری شکل ہے، برتن بھی اسی طرح کالے ہیں۔ برتن تو چلو صاف ہو ہی جائیں گے، لیکن تمہاری شکل ایسی ہی کالی رہے گی۔'' فاطمہ کی چچی اسے ڈانٹ کر باورچی خانے سے باہر چلی گئیں۔ فاطمہ نے دل ہی دل میں آنسو بہاتے ہوئے برتن دھونا شروع کر دیے۔ فاطمہ پانچ سال کی تھی جب اس کے والدین اور تین ماہ کا

بھائی کار حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس لیے اس کے چچا اور چچی نے اسے سنبھالا۔ چچا فاطمہ سے بہت پیار کرتے تھے جب کہ چچی اور ان کی بیٹی زینب، فاطمہ سے بہت نفرت کرتی تھیں۔ چچی اور زینب اپنی خوب صورتی پر بہت غرور کرتی تھیں۔ کیوں کہ چچی کا رنگ بہت گورا تھا اور وہ بہت خوب صورت تھیں۔ زینب بھی اپنی ماں پر گئی تھی۔ لیکن فاطمہ کا رنگ تھوڑا سانولا تھا۔ اسی وجہ سے چچی اور زینب، فاطمہ کے سانولے رنگ پر طعنے دیتی تھیں اور اسے ہر وقت کام پر لگا کر رکھتی تھیں۔ ایک دن چچی فاطمہ کو بہت سارے کام دے کر چچا اور زینب کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ فاطمہ نے جب سارے کام کر لیے تو وہ آرام کرنے کے لیے تھوڑی دیر لیٹی۔ اسے بہت بھوک لگی، وہ اٹھی اور فریج کے پاس جا کر فریج کھولا تو اس میں صرف ایک انڈا تھا۔ اس نے کہا کہ ''چلو میں صرف انڈا ہی کھالوں گی۔'' اس نے انڈا ابالنے کے لیے چولہا جلایا تو گیس ہی نہیں آرہی تھی۔ فاطمہ گیس بند کرنا بھول گئی۔ تھوڑی دیر بعد چچا، چچی اور زینب آگئے۔ زینب کو بہت بھوک لگی۔ اس نے چچی سے کہا کہ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ چچی نے چولہے پر آگ جلائی تو آگ بھڑک گئی اور چچی کے منہ کو لپیٹ لیا۔ جس سے ان کا منہ جھلس گیا۔ کچھ دنوں کے لیے وہ اسپتال میں رہیں۔ واپس آئیں تو ان کا منہ بالکل خراب ہو چکا تھا۔ چچی کو اپنے غرور کی سزا مل چکی تھی، جو انہوں نے بویا وہی کاٹا۔ یہ ہے مکافاتِ عمل۔

تیسرا انعام: 195 روپے کی کتب

خواب یا حقیقت

فرحان ظفر، سرگودھا

جیسے ہی چھٹی کی گھنٹی بجی۔ علی نے بستہ کندھے پر ڈالا اور کلاس سے باہر آگیا۔ کلاس سے باہر آتے ہی علی نے کسی نئی شرارت کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ آخر اس کے ذہن میں ایک نئی شرارت آگئی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا گھر آیا۔ بستہ ایک طرف پھینکا اور اپنی امی سے پیسے مانگنے شروع کر دیے۔

''بیٹا تم نے صبح بھی پیسے لیے اور اب پھر مانگ رہے ہو۔'' اس کی امی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''امی جی! مجھے ایک چیز خریدنی ہے۔'' علی نے ضد کی۔

''تم نے جو چیز خریدنی ہے وہ شام کو خرید لینا۔ اب نہا دھو کر آرام کرنے جاؤ۔''

''نہیں امی! وہ دکان شام کو بند ہو جاتی ہے۔''

علی نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

جب علی نے زیادہ اصرار کیا تو علی کی امی نے علی کو بیس روپے دے دیے۔ علی نے پیسے لیے اور اپنے دوست اسامہ کے گھر پہنچا۔ دونوں مل کر چاچا فضلو کی دکان پر پہنچے۔ علی اور اسامہ نے ایک ایک غلیل لے لی۔ اب دونوں کا رخ جنگل کی طرف تھا۔

''علی مجھے تو پرندوں کے شکار کا بڑا شوق ہے۔''

اسامہ نے کنکر اٹھاتے ہوئے کہا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے جنگل میں پہنچ گئے۔ راستے میں انہوں نے اتنے کنکر جمع کر لیے کہ وہ دونوں آرام سے شکار کر لیں۔ دونوں نے تاک تاک کر پرندوں کو نشانہ بنایا۔ ابھی وہ پرندوں کو مار ہی رہے تھے کہ اچانک دونوں کے کانوں میں آواز آئی۔

''کون ہو تم لوگ اور تم نے میری اجازت کے بغیر ان پرندوں کو کیوں مارا۔''

علی اور اسامہ نے مڑ کر دیکھا کہ ایک بہت بڑا پرندہ ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دونوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن جیسے ان کے پاؤں زمین سے چپک گئے ہوں۔ اتنے میں وہ پرندہ ان کے پاس آگیا اور اپنا سوال دہرایا۔

''مم...... میرا نام علی ہے اور یہ میرا دوست اسامہ ہے۔'' علی نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں اس کی سزا دوں گا۔'' پرندے نے غصے سے کہا۔

''ان دونوں کو غار میں بند کر دو۔'' پرندے نے چیختے ہوئے کہا۔

علی اور اسامہ نے جب یہ سنا تو چیخنا شروع کر دیا۔ اچانک علی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ علی کی امی علی پر جھکی ہوئیں تھیں۔ علی کو آنکھیں کھولتا دیکھ کر انہوں نے علی سے چیخنے چلانے کی وجہ پوچھی۔ علی نے ان کو سارا خواب سنا دیا اور اس واقعے کو خواب ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور پرندوں کے شکار سے توبہ کر لی۔

چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب

اخلاق کی دولت

عمارہ بنت عبدالقدوس

لبنیٰ ایک اچھی لڑکی ہے۔ اس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ

تھا۔ اس میں بہت زیادہ خوبیاں تھی۔ اس میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کا اخلاق بہت اچھا تھا۔ لبنٰی کی کلاس میں ایک لڑکی فاخرہ بھی پڑھتی تھی۔ جو کہ غریب ہونے کے ساتھ ساتھ بدتمیز اور شرارتی بھی تھی۔ لبنٰی کے اچھے اخلاق نے اسے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ویسے بھی فاخرہ کی اس کلاس میں کوئی دوست نہ تھی۔ لبنٰی جو چیز لے کر آتی پہلے فاخرہ کو دیتی پھر خود لیتی۔ فاخرہ کو بس کھانے پینے سے غرض تھی اسے لبنٰی سے کوئی غرض نہ تھی۔ فاخرہ کی نظر اس کی ہر چیز پر ہوتی تھی۔ اس طرح کئی دن گزر گئے۔

ایک شام لبنٰی ایک عورت اس کے دروازے پر آئی اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ پھٹے پرانے کپڑے، گھسا ہوا جوتا، شدید سردی۔ اس نے لبنٰی سے کہا کہ میں ایک غریب عورت ہوں میرے بچے کل سے بھوکے ہیں۔ ان سردیوں میں میرے پاس پہننے کو گرم کپڑے نہیں ہے۔ برائے مہربانی آپ میری مدد کریں۔ لبنٰی نے عہد کیا کہ میں اپنی پاکٹ منی جمع کر کے اس غریب کی مدد کروں گی۔

اگلے دن لبنٰی پاکٹ منی نہ لائی تو لبنٰی سے فاخرہ نے پاکٹ منی نہ لانے کی وجہ پوچھی۔ لبنٰی نے اسے ساری بات بتا دی۔

فاخرہ، لبنٰی سے دور ہوگئی۔ لبنٰی نے اس سے دُور ہونے کی وجہ پوچھی تو اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ لبنٰی کو فاخرہ کے اس رویے سے بہت دکھ ہوا۔

فاخرہ یہ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ سب لڑکیاں لبنٰی کی دوست بنتی جا رہی ہیں۔

فاخرہ نے کہا کہ آج میں دیکھوں گی کہ کلاس میں موجود سب لڑکیاں لبنٰی کی کیسے دوست بنتی جا رہی ہیں۔ لبنٰی نے ابھی پانی کی بوتل کھولی ہی تھی کہ اچانک صدف آگئی۔ صدف نے کہا کہ لبنٰی مجھے پانی دے دو۔ لبنٰی صدف کے لیے گلاس میں پانی انڈیلنے لگی اور اسے دے دیا۔

فاخرہ کو یاد آیا کہ کل سحر نے بھی مجھ سے انک مانگی تھی لیکن میں نے نہیں دی۔

فاخرہ سوچنے لگی کہ لبنٰی نے مجھے دنیاوی دولت میں تو پیچھے چھوڑا تھا لیکن آج ایک اور دولت میں پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ وہ ہے اخلاق کی دولت۔

پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب

فقیر اور کوے کا بچہ

ایک دفعہ ایک فقیر کسی جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ راستے میں اسے ایک کوے کا بچہ نظر آیا۔ وہ درخت کے نیچے پڑا ہوا بھوک سے بار بار اپنی چونچ کھول رہا تھا۔ فقیر کو اس پر بڑا ترس آیا۔ اتنے میں ایک باز نیچے اترا۔ اس کے پنجے میں گوشت کا ٹکڑا تھا۔ باز کوے کے بچے کے پاس بیٹھ گیا اور اسے گوشت کھلانے لگا۔

فقیر نے یہ منظر دیکھا تو بڑا حیران ہوا کہ باز تو پرندوں کا دشمن ہے اور وہ کوے کے بچے کو کھلا رہا ہے! اللہ کتنا مہربان ہے۔ وہ چاہے تو دشمن کے ذریعے بھی روزی دے سکتا ہے۔ فقیر نے سوچا جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر روزی دے سکتا ہے تو میں کیوں روزی کے لیے اتنا پریشان ہوں اور در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ اللہ مجھے بھی ضرور اسی طرح روزی دے گا۔ یہ سوچ کر وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

فقیر کو وہاں بیٹھے شام ہوگئی لیکن کوئی مدد کو نہ آیا۔ بھوک سے اس کا بُرا حال تھا۔ اسی حالت میں رات ہوگئی۔ وہ انتظار کرتا رہا لیکن کوئی اس کے لیے کچھ نہ لایا۔

فقیر صبح اٹھا تو اسے بڑی امید تھی کہ آج ضرور اس کی روزی کا کوئی انتظام ہوگا۔ لیکن وہ دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ اس کے بعد دو دن اور گزر گئے بھوک اور کمزوری سے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ وہ درخت کے نیچے نڈھال پڑا سوچ رہا تھا۔ "اللہ تعالیٰ نے میری روزی کا انتظام کیوں نہیں کیا؟ اگر کوے کے بچے کا انتظام ہو سکتا ہے تو میری روزی کا انتظام کیوں ہو نہیں سکتا؟ کیا اللہ کے نزدیک آدمی کی اہمیت کوے کے بچے سے بھی کم ہے؟ یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا جس نے فقیر سے کہا، "تم نے باز کو دیکھا جو محنت سے کمانا جانتا ہے اور کوے کے بچے کو بھی دیکھا جو باز کا محتاج ہے۔ پھر تمہیں باز بننے کا خیال کیوں نہ آیا۔ تم نے کوے کا بچہ بننا کیوں پسند نہ کیا؟ تم انسان ہو اس لیے باز کا طریقہ اختیار کرو۔ محنت کر کے خود بھی کماؤ اور جو کمزور اور لاچار ہیں انہیں بھی کھلاؤ۔"

یہ خواب دیکھتے ہی فقیر کی آنکھ کھل گئی۔ اسے احساس ہوا کہ جو بات اس نے سوچی تھی وہ غلط تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ محنت کر کے روزی کمائے گا اور کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے گا۔

اعزازی کہانی: مومنہ حجازی، لاہور

دوستی

رائے صاحب نے چھٹیوں میں بچوں پر بہت محنت کی۔ وہ سارا دن ان کو مختلف سبق پڑھاتے رہتے۔ پھر بار بار ان اسباق کی دہرائی کرواتے تاکہ بچوں کو یہ اسباق ازبر ہو جائیں۔ وہ اس سارے عرصے میں ماسوائے عزیق کے تمام بچوں کی تیاری سے مطمئن تھے۔ عزیق نے پرندوں کے علاوہ کسی چیز پر ہرگز توجہ نہیں دی۔ رائے صاحب اسے شکایتاً کہتے۔ ”عزیق! اگر تم نے جیومیٹری پر اتنی توجہ دی ہوتی جتنی تم پرندوں پر لکھی گئی کتابوں پر دیتے ہو تو اپنے ہم جماعتوں سے کہیں زیادہ نمبر لے سکتے تھے۔ تم مجھے تنگ کرتے ہو۔ مجھے کبھی کسی نے اتنا زچ نہیں کیا، جتنا تم نے کیا ہے۔“ تبھی کیکی بولا۔ ”اپنا رومال استعمال کرو۔“ رائے صاحب نے مایوسی اور غصے کی ملی جلی کیفیت سے منہ سے عجیب سی آواز نکالی اور کہنے لگے۔ ”میں کسی دن تمہارے اس توتے کی گردن مروڑ دوں گا۔ تم کبھی اتنی دیر پڑھ نہیں سکتے جب تک یہ توتا تمہارے بازو پر براجمان ہے اور تمہارے علاوہ معاذ بھی اگر اپنے کریہہ پالتو جانور جماعت میں مسلسل لاتا رہا تو یہ جماعت میرے لیے تو کیا سب کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔ تم سب میں صرف نایاب ہے جو پڑھنے میں دھیان دیتی رہی ہے، حالاں کہ وہ یہاں پڑھنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ نایاب کو کام کرنا واقعی پسند تھا۔ وہ خوشی خوشی بھائی کے پہلو میں بیٹھی رہتی اور ویسا کام خود بھی کرتی رہتی جو اس کے بھائی عزیق کو کرنے کے لیے کہا جاتا اور اس عرصے میں جب اس کا بھائی پرندوں کے بارے میں سوچ رہا ہوتا، وہ دیئے گئے کام کو حل کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ اب وہ معاذ کی شرارتوں کو بھی پسند کرنے لگی تھی کیوں کہ اس کا کوئی پتا نہیں چلتا تھا کہ کب اس کی کسی آستین یا جیب سے کوئی نامانوس پالتو جانور برآمد ہو جائے۔

ایک دن پہلے ہی اس کی آستین سے رینگتا ہوا گھاس کا رنگ برنگا ٹڈا نکلا تھا جس سے رائے صاحب بہت ناراض ہوئے تھے اور ایک دن تو ایک ننھا منا پھرتیلا چوہا معاذ کی کسی جیب سے برآمد ہوا اور رائے صاحب کی پتلون کے پائنچے میں جا گھسا تھا۔ اس واقعے سے ساری جماعت تقریباً پندرہ منٹ تک ششدر بیٹھی رہی اور اس عرصے میں رائے صاحب اپنی پتلون میں گھسنے والے چوہے کو نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ عام حالات میں رائے صاحب بہت صابر اور خاموش طبع شخص تھے لیکن عزیق اور معاذ میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ کسی جماعت کا سکون درہم برہم کر سکتے تھے۔ ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں سخت محنت کرتے ہوئے گزر رہی تھیں۔

پھر بچوں کو دی جاتی تاکہ وہ اگلے دن کے اسباق کی تیاری کر لیں اور صبح پوچھے جانے والے سوالات لکھ کر یاد کریں، البتہ شام کو سب بچے بالکل آزاد ہوتے کیوں کہ بچے تھے ہی صرف چار، اس لیے رائے صاحب سب کو ذاتی توجہ دے سکتے تھے اور علم حاصل کرنے میں جو کمی رہتی وہ پورا کروانے کی کوشش کرتے۔ کئی سالوں سے رائے صاحب کو بہت کام یاب اُستاد تصور کیا جاتا رہا تھا حتیٰ کہ انہیں یہ جماعت مل گئی جہاں ان کا استعمال کردہ کوئی حربہ کام یاب نہیں ہو رہا تھا۔ عزیق کو سبق کی طرف راغب کرنا تقریباً ناممکن تھا، اسے پڑھاتے ہوئے رائے صاحب کو کئی دفعہ لگتا کہ وہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا اور اس کی سوچ ہمیشہ پرندوں میں اٹکی ہوتی۔ رائے صاحب سوچتے کہ اگر میرے کندھوں پر پَر اُگ آتے تو شاید عزیق میری ہر بات مان لیتا۔ انہوں نے پرندوں کے لیے کسی کو اتنا پاگل ہوتا نہیں دیکھا تھا۔ پرندے تو دُور کی بات عزیق کو بھی پرندوں کے انڈوں کی بھی پہچان ہو گئی تھی۔ وہ ذہنی طور پر تیز ضرور تھا مگر وہ کسی ایسی چیز پر دماغ لڑانے کو تیار نہیں تھا جس میں اس کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

معاذ واحد طالب علم تھا جس نے پڑھائی میں بہتری دکھائی تھی اگرچہ وہ بھی اپنے پالتو جانوروں سے دوسروں کو زچ کر دیتا تھا لیکن وہ چوہا جو ان کی ٹانگوں پر چڑھا تھا انہیں آج بھی یاد تھا۔ صرف نایاب تھی جو ہر کام قاعدے سے کرتی تھی، بے شک اسے اس میں دلچسپی ہو یا نہ ہو۔ وہ بے چاری صرف اس لیے یہاں موجود تھی تاکہ اپنے بھائی سے جدا نہ ہو۔ جلد ہی معاذ، عزیق اور نایاب پکے دوست بن گئے۔ معاذ اور عزیق کی مشترکہ دلچسپی جو وہ جانوروں اور پرندوں میں دکھاتے تھے، اس دوستی کی ایک وجہ تھی۔ عزیق کا دُنیا میں پہلے کوئی دوست نہیں تھا، اس لیے اسے معاذ کے مذاق اور اس کا تنگ کرنا اچھا لگتا تھا۔ نایاب کو بھی معاذ اچھا لگتا تھا لیکن کبھی کبھار وہ دونوں دوستوں کے درمیان دوستی سے حسد میں مبتلا بھی ہو جاتی تھی۔ کیکی معاذ سے بہت مانوس ہو گیا تھا اور جب بھی معاذ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتا تو وہ عجیب مضحکہ خیز آوازیں نکالتا۔ شروع شروع میں رائے صاحب کو کیکی سے نفرت تھی وہ اپنے بے تکے فقرے بازی سے ان کی جماعت کو پریشان کرتا رہتا تھا۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ وہ چھینکتے رہتے تھے اور کیکی ان کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانا نہ بھولتا۔

کیکی جب انہیں بڑے رعب سے کہتا۔ ''مت چھینکو!'' یہ سن کر ہمیشہ تمام بچوں کی ہنسی چھوٹ جاتی۔ آخرکار رائے صاحب نے کیکی کا جماعت میں داخلہ روک دیا لیکن معاملات اور بگڑ گئے کیوں کہ کیکی جو جماعت میں نہ آسکنے کی وجہ سے سخت ناراض تھا، اور وہ اپنے مالک کے کندھے پر بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا جو اس کے بیٹھنے کی پسندیدہ جگہ تھی، وہ ادھر کھلی کھڑکی کے باہر ایک جھاڑی میں بیٹھ جاتا اور پھر انتہائی اونچی آواز میں بے چارے رائے صاحب پر فقرے کس کر انہیں تنگ کرتا رہتا۔ توتے کی آواز آتی۔ ''بے وقوفانہ باتیں مت کرو!'' یہ اس وقت ہوتا جب رائے صاحب تاریخ کے موضوع پر بہت ہی دلچسپ موضوع چھیڑ چکے ہوتے۔ کبھی کبھار رائے صاحب کو چھینک آجاتی تو کیکی صاحب فوراً فرماتے۔ ''اُستاد جی! آپ کا رومال کدھر ہے؟'' رائے صاحب غصے میں بھرے ہوئے کھڑکی کے پاس جا کر شور مچا کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر کیکی کو اُڑانے اور خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتے تو کیکی صاحب کہتے۔ ''شرارتی لڑکے، میں تمہیں تمہارے کمرے میں بند کر دوں گا، تم شرارتی لڑکے ہو۔'' اور خود ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹتے کیوں کہ ظاہر ہے آپ اس طرح کے ڈھیٹ پرندے کا کچھ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا رائے صاحب نے ہار مان لی تھی اور دوبارہ کیکی کو عزیق کے شانے پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ توتے کے قریب ہونے سے عزیق کی کارکردگی میں بھی اضافہ ہونے لگا اور کیکی بھی کمرے میں رہ کر اتنا تنگ نہیں کرتا تھا جتنا کمرے سے باہر رہ کر۔

رائے صاحب آج کل بہت خوش تھے کیوں کہ جماعت کے واپس جانے کا وقت قریب آ رہا تھا اور چاروں لڑکے اور ایک لڑکی جلد گھر واپس جا رہے تھے اور ظاہر ہے ان کے ساتھ کیکی اور معاذ کے پالتو جانور بھی واپس جا رہے تھے۔ معاذ، عزیق اور نایاب ہر شام لمبے علی اور کمزور حسن کو اکٹھا چائے پیتا چھوڑتے اور خود اکٹھے کہیں نہ کہیں نکل جاتے۔ دونوں لڑکے بڑی دیر تک پرندوں اور پالتو جانوروں کے متعلق گفتگو کرتے رہتے اور نایاب سنتی رہتی اور جب وہ سیر کرتے تو نایاب کوشش کرتی کہ وہ کہیں ان سے پیچھے نہ رہ جائے۔ وہ جتنا زیادہ دُور تک جاتے یا کسی خطرناک ڈھلوان پر چلتے لیکن پھر بھی چھوٹی نایاب ان کا ساتھ دیتی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی بھی لمحے

اس کا پیارا بھائی اس کی نظروں سے جدا ہو۔ کئی دفعہ معاذ، نایاب کی موجودگی سے تنگ آ جاتا اور کہتا۔ ''شکر ہے میری چھوٹی بہن مجھ سے اس طرح چمٹی نہیں رہتی جس طرح نایاب عزیق سے۔'' پھر وہ سوچتا۔ ''پتا نہیں عزیق کیسے گزارا کرتا ہے؟'' لیکن عزیق گزارا کر لیتا تھا حالاں کہ کئی دفعہ وہ نایاب کو اہمیت نہ دیتے ہوئے نظر انداز بھی کر دیتا تھا اور خاصی دیر تک اس سے بات نہیں کرتا لیکن کبھی اپنی بہن کو جھڑکتا نہیں تھا اور نہ ہی اس سے ناراض ہوتا تھا۔ پرندوں کے علاوہ وہ نایاب کا خیال کرتا تھا۔ نایاب کی ساری دُنیا اس کا بھائی تھا۔

تینوں بچے ایک دوسرے کو اپنے متعلق بتاتے رہتے۔ عزیق نے بتایا کہ ہمارے ماں باپ دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، ہمیں اب وہ یاد بھی نہیں ہیں۔ وہ ایک کار حادثے میں فوت ہو گئے تھے، تب ہمیں ہمارے اکلوتے رشتہ دار یعنی ہمارے تایا کے پاس بھجوا دیا گیا جن کا نام چوہدری الیاس ہے۔ وہ بوڑھے ہیں، چڑچڑے ہو چکے ہیں اور ہمیشہ ہم سے غصے رہتے ہیں اور گھر میں واحد ملازم بابا ناظر چھٹیوں میں ہمیں گھر دیکھ کر غصے میں آ جاتا ہے۔ تمہیں کیکی کے ادا کردہ فقروں سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہوگا کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے مثلاً اپنے پاؤں صاف کرو، چھینکومت، فوراً اپنے جوتے بدلو، تمہارا رومال کدھر ہے، کتنی دفعہ تم سے کہا ہے کہ سیٹی نہ بجاؤ اور بے وقوف کیا تم دروازہ بند نہیں کر سکتے وغیرہ وغیرہ۔ معاذ ہنسنے لگا، اس نے عزیق سے کہا کہ واقعی اگر کیکی کی باتیں غور سے سنیں تو تمہیں خاصا مشکل وقت گزارنا پڑ رہا ہے۔ کیا تمہارے والدین بھی فوت ہو چکے ہیں؟ نایاب اپنی سلیٹی آنکھوں سے مسلسل معاذ کو گھور رہی تھی۔ معاذ نے بتایا۔ ہمارے والد فوت ہو چکے ہیں اور وہ اپنے پیچھے کوئی رقم چھوڑ کر نہیں گئے لیکن امی زندہ ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ زیادہ نہیں رہ پاتیں۔'' نایاب نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیوں نہیں؟''

اس کے پوچھنے پر معاذ نے بتایا کہ وہ ایک نوکری کرتی ہیں، وہ اس نوکری سے اتنا کما لیتی ہیں جس سے گھر چلا سکیں اور ہماری اسکول کی فیس ادا کر سکیں۔ وہ ایک آرٹ ایجنسی چلاتی ہیں جس کے لیے انہیں پوسٹر اور تصویروں کے بنانے کے آرڈر لینے پڑتے ہیں اور وہ ان چیزوں کے بکنے سے اپنی فیس لیتی ہیں، وہ ایک بہت اچھی کاروباری خاتون ہیں لیکن ان کے پاس ہمارے لیے زیادہ وقت نہیں بچتا۔ عزیق نے پوچھا۔ ''کیا وہ تم سے پیار کرتی ہیں؟'' وہ اس لیے کرید کر یہ بات پوچھ رہا تھا کیوں کہ اس نے کبھی اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ معاذ نے سر ہلا کر انہیں بتایا کہ وہ بہت اچھی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی خوب صورت امی کے متعلق سوچ رہا تھا اور اسے اپنی ماں کے کام یابی سے کام کرنے پر بھی فخر تھا لیکن کبھی کبھی وہ انہیں بہت تھکی محسوس ہوتیں جب وہ انہیں ملنے آتیں۔ معاذ نے سوچا، ایک دن بڑا ہو کر وہ بھی کام یابی سے کوئی کام کرے گا اور رقم کمائے گا اور اپنی محنت کرنے والی ماں کا سہارا بنے گا۔ نایاب نے پوچھا۔ ''کیا تم بھی ہماری طرح اپنے چچا کے ساتھ رہتے ہو؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ننھی گلہری جو معاذ کی قمیص کی آستین سے اچانک باہر نکل آئی تھی، ہاتھ سے دوبارہ اندر کر دیا۔ معاذ نے بتایا۔ ''ہاں! ہم اپنی تمام چھٹیاں اپنے چچا آصف اور چچی کے ساتھ گزارتے ہیں، میرے چچا بہت سنکی ہیں۔ وہ ہمیشہ پرانے اخبار، کتابیں، دستاویزات خرید کر پڑھتے رہتے ہیں اور انہیں سنبھال کر رکھتے ہیں۔ وہ دراصل سمندر کے کنارے ہونے والی خون ریز لڑائیوں کے بارے میں تاریخ سے شواہد اکٹھے کرتے رہتے ہیں۔ جہاں ہم رہتے ہیں، وہ وہاں کی مکمل تاریخ لکھ رہے ہیں لیکن انہیں ایک یا دو واقعات لکھنے کے لیے بھی ایک سال لگ جاتا ہے اور جب تک وہ یہ کتاب لکھ پائیں گے، مجھے امید ہے ان کی عمر اس وقت چار یا پانچ سو سال ہوگی۔'' یہ بات سن کر سبھی ہنس پڑے، انہوں نے خیالوں ہی خیالوں میں ایک بوڑھے پڑھاکو کو دیکھا جو پرانے بوسیدہ اخبارات کو جھاڑتا رہتا ہے۔ نایاب سوچنے لگی کہ یہ کتنا وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ پھر وہ چچی کے متعلق سوچنے لگی کہ وہ کیسی ہوں گی۔ پھر اس نے پوچھ ہی لیا۔ ''تمہاری چچی کیسی ہیں؟'' معاذ نے اپنا ناک چڑھایا اور کہنے لگا۔ ''تھوڑی نک چڑھی ہیں لیکن اتنی بُری بھی نہیں، بہت محنتی ہیں۔'' ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ ان کا مددگار صرف ایک پرانا ملازم صغیر ہے جو گھر کے کاموں میں ان کی مدد کرتا ہے، اس لیے چچی ہمیشہ تزئین سے ملازموں کی طرح کام کرواتی ہیں۔ میں ان کا کہنا نہیں مانتا، اس لیے انہوں نے مجھے کام کہنا بند کر دیا ہے لیکن تزئین ان سے ڈرتی ہے اس لیے جو چچی کہتی ہیں، اس سے بڑھ کر کام کرتی ہے۔'' نایاب نے پوچھا۔ ''تمہارا گھر کیسا ہے؟'' معاذ نے بتایا کہ بہت مضحکہ خیز اور بہت پرانا ہے۔ کئی سو سال پرانا جو

آدھا ڈھ چکا ہے۔ بہت ہی بڑا ہے اور اس طرح بنا ہوا ہے کہ آدھا ایک چٹان کی ڈھلان پر جیسے اٹکا ہوا ہے اور ایک آدھ بار تو طوفان میں ڈوب ہی گیا تھا لیکن مجھے اس جگہ سے پیار ہے۔ وہ پُراسرار ہے اور ہر وقت وہاں پرندوں کے بولنے اور چیخنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ عزیق تمہیں بھی وہ پسند آئے گا۔ عزیق سوچ رہا تھا کہ واقعی اسے وہ جگہ پسند آئے گی، وہ سن کر ہی پُرجوش ہوگیا تھا۔ اس کا گھر ایک عام سے محلے میں بنا ہوا عام سا گھر تھا لیکن معاذ کے گھر میں تو اسے ابھی سے دلچسپی پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی۔ وہ تیز ہوا، لہروں اور سمندری پرندوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ ان پرندوں کی بولی یہیں سے سن سکتا ہے۔ اس نے انہیں محسوس کرنے کے لیے آنکھیں بند کرلیں، تبھی کیکی چلا کر بولا۔ ”جاگو، جاگو! اے ست انسان!“ ساتھ ہی اس نے آہستگی سے عزیق کے کان پر کاٹ لیا۔ عزیق نے آنکھیں کھولیں اور ہنسنے لگا۔ کبھی کبھار وہ خود حیران ہو جاتا کہ یہ توتا موقعہ کی مناسبت سے بالکل صحیح بات کرتا تھا۔ عزیق نے معاذ سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے گھر کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایسے لگتا ہے آج بھی وہاں کچھ ہونے والا ہے۔ حقیقی، زندہ سلامت، پُرجوش واقعات، سنسنی خیز معرکے!“ ”لیکن میرے گھر میں ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔“ معاذ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میرے گھر میں بھی کچھ نہیں ہوتا۔“ یہ کہہ کر اس نے ننھی گلہری دوبارہ اپنی جیب میں ڈال لی اور دوسری جیب میں ایک خار پشت کا بچہ جس کے کانٹے ابھی سخت نہیں ہوئے تھے، وہ بڑے مزے سے معاذ کی جیب میں چلا گیا جہاں پہلے ہی ایک بڑا گھونگا آرام فرمارہا تھا اور احتیاطاً اپنے خول میں بند تھا۔ عزیق کہنے لگا۔ ”میری خواہش ہے کہ ہم اکٹھے گھر جائیں، مجھے تزئین سے بھی ملنے کی خواہش ہے۔ اگرچہ تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ وہ کوئی خون خوار جنگلی بلی ہے لیکن میں وہاں پائے جانے والے پرندے دیکھنا چاہتا ہوں اور میں تمہارا آدھا رہ جانے والا گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک ایسے گھر میں رہنا جو بہت قدیم ہو اور آدھا تباہ ہو گیا ہو، کتنی دلچسپی کی بات ہے۔ معاذ تم نہیں جانتے تم کتنے خوش قسمت ہو۔“ معاذ نے کہا۔ ”اتنا خوش نصیب بھی نہیں جہاں نہانے کا گرم پانی لانے کے لیے خاصا دُور کا سفر کرنا پڑے۔“ آؤ! اب جانے کا وقت ہو چکا ہے، شاید تم کبھی میرا گھر نہ دیکھ سکو اور ہو سکتا ہے جب دیکھو تو تمہیں پسند بھی نہ آئے اور ویسے بھی جو کام بندہ کرنہ سکے، اس کے بارے میں بات کرنے کا کیا فائدہ ہے۔“ یہ کہہ کر جس گھاس پر معاذ بیٹھا ہوا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کپڑے جھاڑے۔ (باقی آئندہ)

کھوج لگایئے میں حصہ لینے والوں کے نام

عزیز رائے، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ عدن فراز، مردان۔ محمد سلمان عبداللہ، چشتیاں۔ عبداللہ مسعود، ایبٹ آباد۔ مریم ثاقب، محمد مدثر علی، قاسم احمد، فاطمہ اختر، شمع ندیم، ہانیہ نور بٹ، ملک محمد احسن، حارث حسن، امائمہ عالم، محمد فرقان جمال، گل فاطمہ، راول پنڈی۔ حلیمہ حسین گجر، کوٹ سلطان۔ راج ولی خان، نوشہرہ۔ محمد عادل آصف، چونیاں۔ کشف مریم، حذیفہ مشرف، عبیر احمد، محمد سعد، حوریہ حامد، محمد اشفاق احمد، خوش بخت سہیل، کلثوم فرید بلوچ، نشوی عبید، محمد معز، منیبہ اعجاز، فروا طیب، طلحہ قطب، لاہور۔ عمار شاہ، محمد یحییٰ خان، ماریہ شریف، کشف جاوید، سید عبدالباسط شاہ، حذیفہ اظہر، فیصل آباد۔ عبداللہ بن عامر، محمد اشعر شیراز، محمد طلحہ ظفر، ملتان۔ حازق شاہد، اسلام آباد۔ زوہیب مظہر، جڑانوالہ۔ تحریم نور، گجرات۔ آمنہ شوکت، خانیوال۔ عدینہ ہاشمی، آئمہ ہاشمی، نورالعین، رانیہ ملک، گوجر خان۔ سندس آسیہ، علینہ اختر، محمد خضر الیاس، ناعمہ تحریم، محمد اسد، کراچی۔ محمد منیب ستار، آمنہ شاہد، عبدالرحمٰن طاہر، حسان احمد، سیال کوٹ۔ خنساء حسینی، کلور کوٹ۔ بادیہ خالق، محمد سراج جمیل، محمد عمیس، ڈیرہ غازی خان۔ ثمین احمد، محمد شاس حسین، بہاول پور۔ محمد افضل، جہلم۔ بریرہ نعیم، سرگودھا۔ بریرہ غفور، بھمبر۔ طیبہ ذوالفقار علی، فاطمہ نواز، گوجرانوالہ۔ محمد علی اشرف آرائیں، کبیر والا۔ مائرہ غفور، واہ کینٹ۔ اقدس اکرام، فتح جنگ۔ تماضد ساجد، صادق آباد۔ بشریٰ صفدر، تلہ گنگ۔ ثمامہ سہیل، عائشہ صدیقہ، محمد الریان محمد طارق، گجرات۔ احمد امجد، سرگودھا۔ عالم شیر، ساہی وال۔ سائرہ حبیب، غزالہ حبیب، تاندلیانوالہ۔ محمد صدیق قیوم، کھڈیاں خاص۔ اقراء ظفر، نادیہ رفیق، فاطمہ معاذ، میاں چنوں۔ محمد حنظلہ خان، میاں والی۔ زویا رفاقت، بھمبر۔ کشمالہ رضوان، ملتان۔ احمد علی، سرگودھا۔ حریم نعیم، شیخوپورہ۔ عبدالرحمٰن، حسنین بوٹا، شرقپور شریف۔ عبدالمعز اسد خان، پشاور۔ نفیسہ فاطمہ قادری، عائشہ فاطمہ قادری، نور حسین قادری، محمد اسد عبداللہ قادری، محمد عبدالمجید قادری، خدیجہ نشان، حسن رضا سردار وصفی، کاموکی۔

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟
پیارے اور عزیز ساتھیو! جن کے امتحان ہو رہے ہیں۔ ان کی کام یابی کے لیے دُعا گو ہیں اور جن کی سال گرہ ہے ان کی صحت اور تندرستی کے لیے ڈھیروں دُعائیں۔
السلام علیکم! پہلے کی طرح تمام کہانیاں سپرہٹ تھیں۔ جب سے میں نے اس میگزین کو پڑھنا شروع کیا ہے تب سے میرا ایک ہی قاعدہ ہے کہ میں شروع سے لے کر آخر تک اس کو پڑھتا ہوں۔ امید ہے کہ ردی کی ٹوکری اس خط کو ہضم نہیں کر پائے گی۔ ٹیپو سلطان کی بہادری پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اسی طرح نواب صادق محمد عباسی کے متعلق بھی کچھ شائع کیجیے کیوں کہ میرا تعلق بھی انھی کے شہر سے ہے۔ لومڑی کی چالاکی پڑھ کر دل کچھ زیادہ ہی چوکنا ہو گیا۔ رانی کا کارنامہ پڑھ کر ہم نے بھی ایک کارنامہ کیا کہ کاغذ اور قلم اٹھا کر یہ خط لکھ ڈالا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اس میگزین کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ اختتامی شعر ضرور لکھنا پسند کروں گا:

چلے تھے ہم مطالعہ کی راہوں میں
رکے ہیں تعلیم و تربیت کی آغوش میں

(محمد شماس حسین، بہاول پور)

☆ تعریف کا شکریہ۔ آئندہ بھی بھرپور حصہ لیجیے۔
السلام وعلیکم! تعلیم و تربیت ایک ایسا رسالہ ہے جسے ہمارے گھر میں سب بہت پسند کرتے ہیں جب بھی میں فارغ ہوتا ہوں تو تعلیم و تربیت کے بارے میں کچھ لکھتا ہوں۔ پہلے میں نے ایک خط بھیجا لیکن وہ شائع نہیں ہوا۔ پلیز اس بار یہ خط لازمی شائع کریں۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو ترقی دے۔ (عبداللہ مسعود، ایبٹ آباد)

☆ آپ کو خوش آمدید۔ آپ کی آراء اور تحریروں کا انتظار رہے گا۔
ڈیئر ایڈیٹر السلام علیکم! کیا حال ہیں بھئی؟ رسالہ ہمارے بغیر ہی سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ اس مرتبہ تھیلیسیما ڈے پر کہانی بہت زیادہ پسند آئی خصوصاً نظم۔ یہ ان بچوں کی ہمت ہے کہ اپنی بیماری کو کمزوری نہیں بننے دیتے۔ بھنورے کے بارے میں معلومات بھی اچھی تھیں۔ آپ کرکٹ یا دوسرے کھیلوں کے بارے میں معلومات دوبارہ شروع کریں۔ قندِ مکرر ختم ہو گیا ہے؟ یہ ایک اچھا سلسلہ تھا خصوصاً سعید لخت بہت زبردست لکھتے ہیں۔ اس بار کھوج لگایئے میں کامن سینس کا سوال بہت مزے دار تھا۔ البتہ دماغ لڑاؤ میں کافی دماغ لڑایا۔ ''آپ بھی لکھیے'' میں کہانیاں زبردست ہوتی ہیں۔ میرا بھی لکھنے کو دل کرتا ہے۔ ایڈیٹر کی ڈاک میں آپ میرا نام شائع کر دیتے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ ڈاک زیادہ ہوتی ہے مگر پلیز اب تو باری لگا دیں میں نے تعلیم و تربیت ایک دفعہ بند کروا دیا تھا مگر ناراضی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی، اسی لیے اگلے مہینے سے پھر لگوا لیا۔ اس بار ہونہار مصور میں بھی حصہ لیا ہے دیکھتے ہیں ویسے

خط بھیجا اور بھیج کر انتظار کر لیا
اس بار جلد ہی تعلیم و تربیت کا دیدار کر لیا
خط اس بار میرا شائع کرنا پلیز ضرور
ورنہ نام کا تو دو دفعہ دیدار کر لیا......

(تماضر ساجد، صادق آباد)

☆ ڈیئر تماضر! آپ کا خط بہت دل چسپ ہے۔ کہانی ضرور لکھیں۔ خط اتنا پیارا لکھا ہے تو کہانی بھی اچھی ہی ہوگی۔
خط بنام ایڈیٹر صاحبہ! شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ السلام علیکم آپی جان! کیسی ہیں آپ؟ میں بھی ٹھیک ہوں۔ میرا نام عیشۃ الرافیہ ہے۔ میں 11 سال کی ہوں اور ششم جماعت میں پڑھتی ہوں۔ مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ ہر ماہ اس کا شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ پہلے میں اس سے ناواقف تھی۔ پھر میری دوست صالحہ نے اس کا ذکر کیا تو مجھے بھی شوق ہوا۔ دیگر ماہ نامے بھی زیرِ مطالعہ ہیں، مگر وہ باقاعدگی سے نہیں آتے تھے۔ سو ''پیارا، دل چسپ تعلیم و تربیت'' ہی میری توجہ کا مرکز ہے۔ اگست 2016ء سے پڑھتی آ رہی ہوں، مگر خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ امید ہے کہ...... چلیں چھوڑیں پہلے رسالے کی

شان میں شعر سنا دوں:

پیارا رسالہ ہے انمول خزانہ
ملے گا جس سے تمہیں علم کا موتی سہانا

کیسا ہے؟ خود بنایا ہے میں نے اب تعلیم و تربیت کے پڑھنے والوں کے لیے نصیحت ہے:

کبھی نہ جھوٹ بولنا نہ حسد کرنا
گر کر لیا تو انجام دیکھ لینا

(یہ بھی خود لکھا ہے)

اب چلتی ہوں۔ میرے امتحان ہونے والے ہیں دعا کیجیے گا۔ میں ہونہار مصور اور لطائف، پہیلیاں وغیرہ بھیج رہی ہوں ضرور شائع کریں۔ بہت امید ہے۔ نوٹ: میرے خط کو قینچی اور ردی کی ٹوکری سے بہت ڈر لگتا ہے لہٰذا ان سے دور ہی رکھیے گا۔ اللہ حافظ! فی امان اللہ۔ (عیشہ الرافیہ، لاہور)

☆ رافیہ! آپ کا میٹھا میٹھا سا خط دل کو بھا گیا۔ سویٹ سی شاعرہ شکریہ اور باقاعدگی سے آیا کیجیے۔

السلام علیکم! دودھ جیسی صاف اور شہد جیسی میٹھی آپی! مکھن نہیں لگا رہی سچ کہہ رہی ہوں کیوں کہ آپ نے ہمیشہ سچ بولنے کی نصیحت کی ہے۔ تعلیم و تربیت شمارہ بہت اچھا دوست ہے ہمارا۔ جو ہمیں ہمیشہ اچھائی کی طرف لے جاتا ہے۔ میں تعلیم و تربیت کی دو سالوں سے قاری ہوں لیکن یہ میرا پہلا خط ہے اور آپ کو یہ ضرور شائع کرنا ہو گا ورنہ..... ورنہ میں ناراض نہیں ہوں گی اور مسلسل خط لکھتی رہوں گی۔ میں ہونہار مصور اور کھوج لگائیے میں حصہ لینا چاہتی ہوں اگر آپ کی اجازت ہو تو۔ لگتا ہے آپ نے اجازت دے دی تو میں حصہ لے ہی لیتی ہوں۔ میں مختصر مختصر کے لیے کچھ تحریریں بھیج رہی ہوں اگر آپ کو پسند آئیں تو ضرور شائع کیجیے گا۔ میں آپ کو بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن جگہ کم ہوتی ہے اس لیے خط زیادہ بڑا نہیں کرنا چاہتی اگر خط بڑا ہو گیا تو شائع ہونے کے چانسز کم ہوں گے اس لیے پلیز ضرور شائع کیجیے گا۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور تعلیم و تربیت اسی طرح پوری دنیا میں ستارے کی طرح چمکتا رہے۔ (آمین)۔

آپ سے جڑی امید کی ایک چھوٹی درخواست:

امید ہے آپ اسے توڑیے گا مت
پلیز شائع کر دیجیے میرا یہ ہے پہلا خط

(نادیہ رفیق، وجھیانوالہ)

☆ نادیہ آپ نے بھی بہت پیارا خط لکھا ہے۔ مکھن نہیں لگا رہی سچ کہہ رہی ہوں۔ ہر سلسلے میں ضرور حصہ لیجیے گا۔

ہیلو آپی، کیسی ہیں آپ؟ آپ میری فکر بالکل نہ کریں کیوں کہ میں تو بالکل ٹھیک بھی کیسے نہ ہوں۔ مئی کا رسالہ جب آنکھوں کے سامنے سے گزرا تو دل میں شہنائیاں بجنے لگیں۔ ویسے تو بہار کا موسم جا رہا ہے لیکن رسالے میں اپنا خط دیکھ کر دوبارہ سے بہار واپس لوٹ آئی۔ اگر بات مئی کے رسالے کی کی جائے تو رسالہ سپر ڈوپر ہٹ تھا۔ اختلاف، مشغلے کا فائدہ، پپیتے کی چور، غرض یہ کہ ہر کہانی لاجواب تھی۔ اب اجازت چاہوں گی۔ آخر میں ''تعلیم و تربیت'' کے لیے:

تعلیم و تربیت پڑھنا نہ چھوڑنا
خط شائع نہ ہو تو ایڈیٹر سے منہ نہ موڑنا

یہ بھی میں نے خود لکھا ہے۔ آخر میں ایک شاعرہ بھی تو ہوں نا!!

(زویا رفاقت، بھمبر)

☆ پیاری اور ننھی منی شاعرہ۔ خط کے لیے شکریہ۔ ہمیشہ خوش رہیں۔ آمین۔

جگہ کی کمی کے باعث صرف نام شائع کیے جا رہے ہیں

ہشام احمد، حضرو۔ فاطمہ معاذ، اقرا ظفر، نادیہ رفیق، وجھیانوالہ۔ انوشہ فاطمہ، مبشرہ فاطمہ، عبدالرحمٰن، زین العابدین، سیال کوٹ۔ گل فاطمہ، ایمان فاطمہ، عمر بشیر، محمد سمیع، اسلام آباد۔ فلذہ وقار، ہارون وقار، جہلم۔ سائرہ حبیب، مریم اورنگ زیب، تاندلیانوالہ۔ شائلہ کنول، ساہی وال۔ حظلہ نیازی، زارا، سدرہ اختر، محمد عمیس خان، ڈیرہ غازی خان۔ طلحہ قطب، وقار علی، یوسف صلاح الدین، محمد انس نور، لاہور۔ محمد حسیب، جوہر آباد۔ مہوش قدیر، محمد محسن طارق، طیب احسان، گوجرانوالہ۔ ایمان کامران، شیخ وقاص الٰہی، محمد مجاہد علی، راول پنڈی۔ ریحان خورشید، فرحان خورشید، کلورکوٹ۔ بریرہ غفور، عدنان خان، آزاد کشمیر۔ ذنیرہ بانو، کمالیہ۔ محمد محسن طارق، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عکاشہ طارق، ملتان۔ عثمان رضا، شرمین غنی، کاشف صدیقی، رحیم یار خان۔ محمد رضوان جاوید، علی اکرام، امبرین خان، کراچی۔ نور العین فاطمہ، حیدر آباد۔ محمد ثاقب نصیر، فرحان محبوب، ایبٹ آباد۔ عون زکریا، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔

اُس کی نگاہیں میری طرف اٹھیں۔ جیسے ہی اُس نے مجھے دیکھا، اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ نہ جانے کیوں مجھے بے حد عجیب سا لگا۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔ بس! مجھے اب یہ احساس تنگ کر رہا تھا کہ وہ مجھے دیکھے مگر اپنائیت سے...... میں اس سے کچھ کہوں۔ چند ساعتوں کے بعد ایک بار پھر اس کی گردن ہلی، مجھے متوجہ پا کر اس نے پھر اُسی جانب پھیر لی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ یہاں میرا اور اس کا آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ میرے بھائی جان کاروباری سلسلے میں ملتان گئے تھے۔ آج وہ کراچی واپس آئے تو اطلاع ملی کہ وہ کچھ شالیں وغیرہ ساتھ لا رہے ہیں۔ والد صاحب نے حکم دیا کہ بھائی جان تھکے ہوئے ہیں، اس لیے انہیں اور سامان کو بہ حفاظت گھر لے آؤں۔ ان کا حکم بھلا کیسے ٹال سکتا تھا۔ میں ریلوے اسٹیشن چلا آیا۔ ٹرین کے آنے میں دیر تھی اس لیے میں انتظار میں پلیٹ فارم پر اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا کہ اس پر اچانک نظر پڑ گئی۔

پلیٹ فارم نمبر 2 سے ایک ٹرین نے روانگی کے لیے وسل دی تو ایک بار پھر اس کی گردن بے اختیار ٹرین دیکھنے کے لیے مڑ گئی۔ پھر ہماری نظریں چار ہوئیں اور...... میں اس کی مسکراہٹ کا تمنائی تھا لیکن اب کی بار اس نے کمال حقارت سے اپنا منہ گھما لیا۔ میرے دل میں ایک کسک پیدا ہو گئی۔ میں جانے اَن جانے میں اس کا مجرم تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے ہی اس کے ارمانوں کا خون کیا تھا اور اب اس سے ہمدردی کا خواہاں بھی تھا۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا؟

میں آپ کو اصل بات بتاتا ہوں، میرا نام سلطان ہے، یہ لڑکا ارسلان اسکول میں نہ صرف میرا ہم جماعت تھا بلکہ ہماری رہائش بھی ایک ہی محلے میں تھی۔ ہماری علیک سلیک کبھی گہری دوستی میں تبدیل نہ ہوئی تھی اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں ٹھہرا ایک نمبر کا شرارتی۔ مجھے دوستوں کو چھیڑ کر جو لطف آتا تھا وہ کسی اور کام میں نہیں۔ میں نے ارسلان کے ساتھ بھی شرارتوں کا سلسلہ رکھا اور ایک سے بڑھ کر ایک شرارتیں کیں اور یہ بھی ٹھہرا صابر...... سادگی سے ہماری مصیبتوں کو جھیل جاتا۔ میری آخری شرارت جو اس کے لیے بے حد بڑی اور تکلیف دہ بن گئی، ویسے مجھے اس کا وہم و گمان تک نہ تھا لیکن میں یہ شرارت کر گزرا۔

ہوا یوں کہ میں نے ان کے گھر کے ساتھ والی دکان کی چھت پر اس کا جوتا اٹھا کر پھینک دیا۔ اس نے ناراض ہو کر منہ بنا لیا۔ شام کا وقت تھا، دکان بند تھی۔ وہ اُسے لینے کے لیے دیوار پھاند کر چھت پر چڑھ گیا۔ ہم نے موبائل سے نہ صرف اس وقت کی تصاویر اتاریں بل کہ پرچون فروش کو واٹس ایپ بھی کر دیں۔ تھی تو یہ محض شرارت...... لیکن کسے خبر تھی کہ چھوٹی سی شرارت کسی کے لیے روگ بھی بن سکتی ہے۔ دو تین روز بعد اسی دکان سے نقدی اور مال چوری ہو گیا۔

چور چھت کے راستے ہی سامان لے گئے تھے۔ ہماری بھیجی ہوئی تصاویر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دکان دار نے اس چوری کا الزام بے چارے ارسلان پر ڈال دیا۔ وہ بے حد بے تمیز اور چڑچڑا دکان دار تھا۔ اس نے ایک نہ سنی اور سارا محلّہ سر پر اٹھا لیا۔ ارسلان نے لاکھ سمجھایا کہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ دکان دار بڑا کایاں تھا، وہ اپنے مال کی فکر تو بھول گیا لیکن ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔ مختلف لوگوں کو اپنا ہم نوا بنا کر اس نے انہیں اس محلے سے نکلوانے کا راستا بنا لیا۔ میرا بہت دل کیا کہ اسے اس مشکل سے نکالوں لیکن یہ ساری آگ بھی تو میری ہی لگائی ہوئی تھی۔

وہ اس معاملے میں اتنا رُسوا ہو چکا تھا کہ اب اس کے گھر والے بھی اس محلے میں رہنے کو تیار نہ تھے۔ میں سمجھا کہ وہ دو چار گلیاں چھوڑ کر کسی اور محلے میں جا بسیں گے۔ لازماً اس کا اسکول بھی تو وہیں تھا، لیکن یہ کیا...... اسٹیشن پر ان کی پورے گھرانے کو مع ساز و سامان کے ٹرین کے انتظار نے یہ بات کھول دی کہ وہ کراچی چھوڑ کر کسی اور شہر کی جانب روانہ ہو رہے ہیں۔ میں اپنی نظروں میں آپ گر گیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ہلکی سی بھی اپنائیت کا اظہار کرے تو میں جا کر اس سے معافی مانگ لوں۔ اس کے ہاتھ جوڑوں اور گلے شکوے مٹانے کی بھرپور کوشش کروں...... لیکن افسوس! وہ تو مجھ سے بے حد متنفر ہو چکا تھا۔ میری آنکھیں اب نم دیدہ ہو چکی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ غالب ایکسپریس روانہ ہونے لگی تو ارسلان اور اس کے گھر والے اس میں سوار ہو گئے۔ میں انہیں جاتا دیکھ رہا تھا کہ بھائی کی ٹرین بھی آ گئی۔ میں ان کے گاڑی سے اترنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ آ گئے تو میں نے ان کا سامان اتروایا اور جلدی سے ٹیکسی میں رکھنے لگا۔ کئی دنوں تک میرے ذہن سے ارسلان کی یوں روانگی یاد آتی رہی۔ اس کے بعد کچھ ایسا ہوا کہ میں شرارتیں بھول سا گیا۔

میں نے میٹرک کر لیا اور کسی اچھے سے کالج میں داخلہ لینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک سے والد صاحب کے دل کی شریانوں میں تنگی کا مسئلہ سامنے آیا۔ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ شروع ہوئی، جب بڑے اسپتال پہنچے تو انہوں نے بائی پاس آپریشن تجویز کیا۔ چھ لاکھ کا پیکج تھا، ہمارا کاروبار تو تھا لیکن لاکھوں کا نہ تھا۔ جیسے تیسے کر کے رقم کا بندوبست کیا گیا اور آپریشن کرایا گیا۔ اس کے بعد بھی روپیا پانی کی طرح بہتا رہا۔ میں نے پرائیویٹ کالج میں داخلے کا ارادہ ترک کر کے سرکاری کالج کا رخ کیا۔

والد صاحب بیماری کے بعد دکان سے دُور ہو گئے۔ بھائی جان نے دکان چلانا شروع کی لیکن وہ اسے اچھی طرح سنبھال نہ سکے۔ گاہکوں کو کئی ہزار کا مال ادھار دیا جاتا رہا، اوپر سے کمپنیوں کے دو تین لاکھ کا قرضہ ہو گیا۔ بار بار کے تقاضوں اور والد صاحب کی بگڑتی ہوئی طبیعت نے بھائی جان کو بھی بیمار سا کر دیا۔ کام دن بہ دن روبہ زوال ہوا اور آخر کار دکان کا دیوالیہ نکل گیا۔ یہاں والد صاحب ایک بار پھر ایمرجنسی وارڈ میں پہنچے تو ان کی واپسی گھر کے بجائے آخری آرام گاہ کی طرف ہوئی۔ ہنستا مسکراتا گھرانا اب سناٹے کا مسکن تھا۔ میرا دل اب پڑھائی میں نہ لگتا تھا۔ جیسے تیسے کر کے میں نے انٹر پاس کیا۔ بھائی جان مختلف جگہوں پر ملازمت کر کے گھر کا خرچ چلانے کی سعی کرتے رہے لیکن انہیں خاطر خواہ کام یابی نہ ہوئی۔

امی نے حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر مکان چھوڑنے اور نانی کے ہاں ملتان چلنے کے لیے کہا۔ نانی کی کچھ زرعی زمین تھی جو کسی اور کو مقاطعے پر دی ہوئی تھی۔ معاہدہ ختم ہو گیا تھا لہٰذا اب نانی کا خیال تھا کہ وہ زمین ہم دونوں بھائی سنبھال لیں اور اس کی کمائی سے اپنے گھر کا خرچ چلائیں۔ حالات اچھے نہ تھے ایسے میں یہ خیال بُرا نہ تھا، اس لیے ہمیں ماننے میں کوئی عذر نہ ہوا اور ہم تینوں نے گھر کا بچا کھچا سامان سمیٹا اور ایک شام ٹرین میں بیٹھ کر ملتان شریف آ گئے۔

میں بہت کم ملتان آیا تھا۔ چوں کہ یہیں زندگی بتانی تھی اس لیے اس کے ماحول میں خود کو شامل کرنا شروع کر دیا۔ یہاں کی

گرمی ناقابل برداشت تھی لیکن کیا کیا جائے کہ وقت اور حالات کے آگے انسان کو اپنا سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ ہم نے کھیتی باڑی کا کام سنبھالا اور زمین پر چاولوں کی کاشت شروع کر دی۔ دونوں بھائیوں نے خاصی محنت کی اور ایک سال بعد ہی ہمیں اس کے بے حد اچھے نتائج ملے۔ قسمت ایک بار ہم پر پھر مہربان ہوگئی اور خوش حالی نے ہمارے قدم چومنا شروع کر دیے۔

ہم اب اپنی کاشت کاری کو اور بڑھانا چاہ رہے تھے۔ نانی نے بتایا کہ قابل کاشت زمین کے ساتھ دو کنال اور زمین بھی ان کی ہے جو ویران اور غیر آباد ہے اسے بھی کار آمد بنایا جائے۔ ہم نے اس پر کام شروع کرایا تو ایک اور پارٹی سامنے آگئی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ زمین ہماری ہے۔ ان کے پاس بھی کاغذات موجود تھے۔ نانی کا کہنا تھا کہ انہوں نے سُستی اور غفلت میں اس کی رجسٹری نہیں کرائی۔ وہ زمین کام بھی نہیں آرہی تھی اس لیے ان کی اس قدر دل چسپی بھی نہیں تھی۔ اب صورت حال خراب ہوگئی تھی۔ بہرحال! اب اس معاملے کی درستی ہم دونوں بھائیوں کے حوالے تھی۔ بڑے بھائی تو زمیں داری سنبھال رہے تھے اس لیے اس مسئلے کو حل کرنے کی ذمے داری میری ہی ٹھہری۔ میں نے پکا ارادہ کرلیا کہ اس کام کو بخوبی انجام دوں گا۔

جب متعلقہ محکمے کا رخ کیا تو بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ کیا کلرک، کیا نائب قاصد اور کیا ہی سپروائزر...... سب ہی عدم تعاون کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان کا رجحان دوسری پارٹی کو درست قرار دینے کی طرف تھا۔ بار بار کے چکروں اور تکرار نے مجھے مایوس سا کر دیا تھا۔ ایسے میں اس دفتر سے اپنے معاملے کو سہل طریقے سے نمٹانے والے ایک نیک دل انسان نے بتایا کہ اس محکمے کا افسر جو کہ مختار کار کہلاتا ہے، انتہائی انصاف پسند اور نرم دل ہے۔ وہ لین دین کے بجائے سائل کے جائز کام کو کر کے خوشی محسوس کرتا ہے اس لیے اس سے ملا جائے۔ اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں...... مجھے ایک راستہ سجھائی دیا تھا، اُمید کی ایک کرن جاگ گئی تو میں نے افسر سے ملنے کی ٹھان لی۔ کبھی قاصد نے ٹال دیا تو کبھی افسر فیلڈ میں ہوتا تھا، یوں دو تین روز ملاقات نہ ہوسکی۔

چوتھے روز اتفاق سے افسر دفتر میں موجود تھے۔ گیٹ پر بھی کوئی نہیں تھا اس لیے میں اندر داخل ہوگیا۔ سلام کے بعد اجازت چاہی تو خوش دلی سے مل گئی۔ میں اندر ان کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔

''دیکھیے سر! یہ زمین میری نانی جان نے سن 1985ء میں خریدی تھی اور یہ خریداری کی دست آویز ہیں۔''

میں نے فائل ان کے آگے رکھ دی۔ وہ افسر بڑے انہماک سے اس فائل کو دیکھنے لگا۔ اس نے تمام کاغذات کا بہ غور جائزہ لینے کے بعد سر اُوپر اٹھایا اور کرخت لہجے میں سوال کیا۔

''اب آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''

''سر! اس زمین کے دوسرے دعوے دار پیدا ہو گئے ہیں جو سن 2000ء کی خریداری دکھا رہے ہیں جب کہ میری نانی نے کسی کے ساتھ اس زمین کا سودا کیا ہی نہیں۔''

''آپ کی نانی حیات ہیں؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''جی الحمد للہ!'' میں نے خوش دلی سے کہا۔

''کل دوپہر دو بجے انہیں لے آیئے۔ میں ان کا بیان لوں گا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور پھر دوسری پارٹی کو بلا کر ان کی بات بھی سنوں گا۔ پھر آپ کے معاملے کو حتمی نتیجے تک پہنچاؤں گا۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''سر! ہماری زمین تو ہمیں مل جائے گی ناں۔'' میں نے حلق سے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''انصاف سے کام کیا جائے گا۔'' اس نے بغیر لگی لپٹی کے ایمان داری سے کہا۔ ''جس کا جو حق ہوگا، اسے ضرور ملے گا۔''

اس کے بعد اس نے ایک اور فائل کھول کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی جس کا مطلب یہ تھا کہ اب میں جا سکتا ہوں۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ کیوں نہ ہوتے، ایک ایمان دار افسر نے سچ کا ساتھ دینے کا عزم جو کیا تھا۔

اگلے روز وقت مقررہ پر میں نانی کو لے آیا۔ افسر نے ان سے مختلف طرح کے سوالات کیے۔ زمین سے متعلق جو بھی بات جرح والے انداز میں کی جا سکتی تھی، وہ اس نے پوچھی۔ کہیں کہیں تلخی بھی اس کے لہجے میں تھی، اس کے باوجود مجھے یہ افسر اس لیے بھایا کہ وہ کسی کو اس کا حق دلانے کے لیے کوشاں تھا اور انداز سے احتیاط کا متقاضی تھا۔

اگلا دن...... پھر اگلا دن...... اس نے زمین کا دورہ بھی کیا۔

ان پارٹیوں سے ملاقاتیں کیں۔ دونوں طرف سے حلف نامے بھی طلب کیے گئے۔ ہمیں کسی قسم کا کوئی ملال نہ تھا اس لیے فائل کا پیٹ بھرتے گئے۔ دوسری پارٹی سروے اور خریداری کے معاہدے کے اصل دست آویز پیش نہ کر سکے۔ انہیں ایک ہفتے کی مہلت دی گئی۔ کہتے ہیں ناں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے...... اس لیے وہ بھی اس افسر کی گرفت میں آ گئے۔ اگر کوئی مرتشی افسر ہوتا تو وہ مک مکا کر کے زمین ہڑپ کر گئے ہوتے لیکن یہاں ایسا ممکن نہ تھا۔

جب مقررہ مدت سے بھی ایک ہفتہ اوپر ہو گیا اور وہ پارٹی کاغذات پورے کرنے میں ناکام ہو گئی تو مختار کار نے ہمارے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے کاغذات کی فوری رجسٹری کرا لینے کا مشورہ دیا۔ نانی ہم دونوں بھائیوں سے محبت کا دم بھرتی تھیں اس لیے انہوں نے وہ زمین ہمیں ہدیہ کر دی اور رجسٹری ہمارے نام کرنے کے لیے کاغذات پر دست خط کر دیے۔ مختار کار نے جلد از جلد کارروائی کی یقین دہانی کرا دی۔ ایک ماہ بعد ہماری زمین کی رجسٹری ہو گئی۔

''آپ کو زمین بہت بہت مبارک ہو پنکو۔'' افسر نے فائل میرے حوالے کی تو میں وہ لے کر ان کا شکریہ ادا کر کے خوشی خوشی ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اچانک ہی میرے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ میں ان لفظوں پر غور کرنے لگا جو ابھی ابھی مختار کار نے ادا کیے تھے۔ یقیناً اس نے مجھے ''پنکو'' ہی پکارا تھا۔ میرا یہ نام تو صرف میری کراچی والی کلاس کے دوست ہی جانتے تھے اور وہی مجھے پنکو پکارتے تھے۔ اپنے شک کو دُور کرنے کے لیے میں نے افسر کے نام کی تختی دیکھنے کے لیے سر اوپر کیا تو مجھے لکھا ہوا نظر آیا۔

ارسلان علی بیگ

مختار کار، زرعی زمین

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ چند ساعتوں قبل میرے اندر پیدا ہونے والی خوشی کے جذبات ایک دم سے ماند پڑ گئے۔

''تلافی تو کی جا سکتی ہے۔'' اچانک ہی میرے ذہن نے مشورہ دیا۔ میں پلٹا، میں نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اس کی نگاہیں اٹھیں، ہماری نظریں جیسے ہی چار ہوئیں، اس نے ایک دم سے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میرے پیر من من بھر کے ہو کر رہ گئے۔

☆☆☆

زوزی ایک گندا مندا مگر مچھ تھا جس کی ماں نے جب اسے جھیل کنارے کھیلنے کو تنہا چھوڑا تو اس نے پلٹ کر پھر کبھی ماں باپ کو نہ دیکھا۔ اپنی دنیا میں مست نئے نئے دوست بنا کر رہنے لگا۔ جھیل کنارے بہت خوب صورت پھولوں کی قطاریں تھیں جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں تو گلابی گلابی پھول مستی سے جھوم جھوم جاتے۔ زوزی بھی خوب انگڑائیاں لیتا، گھاس کی کوملتا (نرمی) میں گھومتا گھامتا اور ننھے ننھے مینڈکوں سے پیٹ بھر کر مزے لوٹتا، اسے دراصل ابھی بڑے شکار کے متعلق خاص شعور و آگاہی نہیں تھی۔ کوئی بھولی بھالی تتلی اگر اس کی لمبی سی کمر پہ آ کر بیٹھتی تو گدگدی محسوس کر کے وہ قہقہے لگاتا۔ بطوبی کے تمام چوزے بڑے ہو کر جب جھیل کنارے کیچڑ میں سے کیڑے مکوڑے کھانے کو آتے تو وہ انہی کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ زوزی کو ایک روز بطوبی کے سب سے لاڈلے بطے نے کہا کہ زوزی یار کبھی دلدلی مٹی سے نکل کر جنگل کی بھی سیر کرو تو یہ آئیڈیا زوزی کو بہت پسند آیا کہنے لگا: ''مگر اے دوست جنگل والے برا تو نہیں مانیں گے۔'' بطے نے کہا: ''ارے یہ کیا بات ہوئی بھلا جب ہم جھیل کنارے آتے ہیں تو کیا تم برا مناتے ہو۔ نہیں نا تو پھر چلو آج جنگل کی سیر کو چلو۔ شام ڈھلے جی چاہے تو لوٹ آنا ورنہ ہمارے گھر کے پچھلے احاطے میں پڑے سوئے رہنا۔'' زوزی نہا دھو کر اُجلا اُجلا ہو گیا اور تمام بطے جو تعداد میں چھ تھے اس کی پشت پر بی بطو سمیت بیٹھ گئے۔ ''ارے واہ! زوزی تمہاری کمر تو ہمارے لیے جھولا بن گئی۔'' سفر شروع ہوا تو ہلکے ہلکے بادل ہواؤں میں تیرنے لگے، ٹھنڈی ہوا چلنے لگی، درختوں کے پتوں کے سرسرانے کی آوازیں آنے لگیں، جنگلی پھولوں کی خوش بوئیں ہوا کے ساتھ فضا کو مہکانے لگیں۔ موسم بے حد خوب صورت ہو گیا۔

سب سے پہلے بلو ریچھ کا گھر آیا تو بلو ریچھ مگر مچھ پہ چھ سات بطخیں دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا: ''بہت خوب! پہلی بار دیکھا ہے بطخوں کو مگر مچھ پہ سوار۔'' ''چاچو بلو! یہ ہمارا دوست زوزی ہے۔ جھیل کنارے اس کا گھر ہے۔ پہلے آپ نے کبھی اسے دیکھا۔'' ''وہاں ہاں اوں یاد آیا مگر یاد رہے مگر مچھوں کو جنگل میں لانا خطرے سے خالی نہیں کہیں یہ کسی کو شکار نہ بنا لے۔ خیر اب ایسی بھی بات نہیں چاچو بلو یہ تو معصوم سا مگر مچھ ہے۔ اچھا دوستو پھر ملیں گے۔'' چاچو بلو چاچی جی کی آواز پر گھر کے اندر دوڑتے چلے گئے۔ اچھے شوہر کی یہی تو نشانی ہے، سب بطخوں نے سیٹی بجا کر داد دی۔ چلتے چلتے یہ سواری اور سوار جنگل کے خوب صورت پنچھی مور کے پاس جا پہنچے۔ مور اور مورنی رقص میں مصروف تھے، اپنے آپ میں مگن اس لیے

اسی کا ناچ ہی دیکھتے رہے۔ بات نہ کر پائے اور آگے چل پڑے۔ آگے ایک بکریوں، مینڈھوں گائیں اور بیلوں کا بہت بڑا غول تھا۔ ''اتنی بھیڑ میں ڈر لگتا ہے زوزی ہم کچلے نہ جائیں۔'' مگر یہ بات سب نے سن لی اور انہیں گزرنے کو کافی راستہ بنا دیا۔ ''دوستو ہم دوستو کے دوست ہیں آرام سے گزرتے چلے جاؤ۔'' گاں گاں، میں میں، بھے بھے کی آوازیں باجوں کی صورت بج رہی تھیں۔ یہ بھیڑ ختم ہوتے ہی گاجروں، مالٹوں، گنوں کے باغات شروع ہو گئے کیوں کہ موسم بھی سرما کا تھا اس لیے پھلوں کی بہتات تھی۔ ''اتنے پیارے گول گول یہ نارنجی رنگوں کے گیند بھلا درختوں پر کیسے لگے ہیں۔'' زوزی آنکھیں مٹکائے ہوئے بولا۔ ''اور یہ لمبے لمبے ہرے ہرے بانس کیسے ہیں اور یہ زمین پہ لال لال لمبی موٹی چھوٹی اتنی ڈھیری کیا چیزیں ہیں۔'' گاجروں کے کھیت تو اگائے تھے خرگوش فیملی نے۔

آج ان کے ہاں ننو خرگوش جو ملکہ خرگوشنی کا بیٹا تھا، اس کی سال گرہ تھی تو سب خرگوشوں نے خوب کھدائی کرنے کے بعد گاجروں کا ڈھیر لگا ڈالا تھا کیوں کہ یہ ان کی پسندیدہ خوراک تھی اور اب جب بطے زوزی دیکھنے کے بعد حیران تھے تب خرگوش فیملی نے انہیں بھی سال گرہ میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ ''مگر ہم ننو خرگوش کو کیا تحفے پیش کریں گے۔'' بطو بی بولیں۔ ''آں ہاں ایک منٹ ہم انہیں مالٹوں کے ہار بنا کر پیش کریں گے۔ چلو زوزی جلدی کرو اپنی دم سے درخت ہلاؤ تاکہ موٹے موٹے مالٹے گریں اور ہم سرکنڈوں کے پتوں سے ہار بناتے ہیں۔'' اسی طرح انہوں نے ڈھیروں مالٹے اکٹھے کیے، ہار بنائے اور ہر خرگوش کو ایک ایک ہار پیش کیا۔ یہ انوکھے ہار خرگوش فیملی کو بے حد پیارے لگے۔ سفید سفید خرگوش نارنجی نارنجی ہار ہر طرف خوش بو کی بہار۔ اسی لمحے کیک کاٹا گیا جو گاجروں سے بنا ہوا خصوصی کیک تھا۔ زوزی سبزی خور نہیں تھا مگر خرگوش فیملی کا دل رکھنے کو ایک آدھ کیک کا ٹکڑا مرتا کھا گیا۔ بعد میں گاجر کے ڈکار اسے پریشان کرتے رہے مگر خیر اب کیا ہوتا۔ وہ خوشیوں میں شامل نہ ہوتا تو جھیل کنارے کوئی اڑتی مکھی یا اچھلتا مینڈک ہی کھاتا رہتا اور کروٹیں بدل بدل کر رات ڈھلے سو جاتا۔ اس خوش نما زندگی کا تو زوزی کو اب اندازہ ہوا تھا جب آج جنگل کی سیر کرتے کرتے یہ سال گرہ بھری محفل مل گئی تھی۔ ''اب دوپہر ڈھلنے والی ہوگئی ہے۔ سفر پھر شروع کرتے ہیں۔'' بطخیں قیں قیں بولیں

کیوں کہ اس پارٹی میں مزید بطخیں بھی آچکی تھیں اس لیے وہ بھی بطو بی کے بچوں کے ساتھ مل کر زوزی کی پشت پر اِدھر اُدھر جگہ بنا کر بیٹھ گئیں کہ بھئی آدھے گھنٹے بعد ہمارا گھر آئے گا۔ ادھر شمال کی جانب ہمیں وہاں تک ساتھ لے چلو۔ تمہارا شکریہ۔ ابھی انہیں یہاں سے رخصت ہوئے کچھ لمحے ہی ہوئے تھے کہ زور دار بارش آگئی۔ ''ادھر کوئی سایہ دار جگہ تلاش کرو، جلدی کرو ورنہ ہم بھیگ گئے تو سرما کی اس بارش میں بیمار پڑ جائیں گے۔'' اور حکیم صاحب جو خالو ہرن تھے وہ بھی موجود نہیں تھے کہ وہ دوسرے جنگل میں اپنے بھائی ہرن کے بیٹے کا علاج کرنے گئے ہوئے تھے۔ ''چلو جلدی کرو۔'' بطخوں نے غل مچا دیا، ادھر غار ہے۔

ایک بڑے برگد کے درخت کے پچھلی طرف بارش تیز ہونے لگی۔ ساتھ ساتھ اولے بھی برسنے لگے۔ ''آہ آہ اوہ اوہ یہ سفید پتھر بہت زور کے لگ رہے ہیں میری کمر پہ۔ بچاؤ بچاؤ۔'' زوزی کراہا۔ ''دوست ہمت رکھو، بھاگو، پانی بڑھ رہا ہے۔ غار کی طرف چلو۔'' ''اچھا میں پوری کوشش کرتا ہوں۔ اوہ میں تو بھول گیا کہ میں تو بہت اچھا تیراک بھی ہوں۔ پانی بڑھ گیا تو غم نہ کرو، میں تیرنا جانتا ہوں تیرلوں گا۔'' سب بطخیں بھی اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔ ''اوہو تیرنا تو ہم بھی جانتے ہیں ہم تو پانی کی رانیاں اور راجے ہیں۔ بس پریشانی میں ہم تو اپنی صلاحیتوں کو بھول ہی گئے جو قدرت نے ہمیں عطا کی ہیں۔'' انہی باتوں میں وہ غار کے دہانے تک آگئے مگر یہ کیا اندر تو شیر اور شیرنیاں براجمان تھیں اور بُری بُری نظروں سے آنے والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ''کیا ہمیں خوش آمدید نہیں کہو گے دوستو!'' ''کیسے دوست؟'' ''جنگل کا بادشاہ کسی کا دوست نہیں ہوتا۔'' شیر غرایا تو غار میں گرج سی گونجی۔ ''مگر انکل آپ تو سرپرست بھی ہیں تمام جانوروں کے۔ پلیز ہمیں تھوڑی دیر رکنے دیں۔ بارش بہت تیز ہے۔ ہمارے پنکھ بھیگ چکے ہیں، سردی سے بُرا حال ہے۔'' ''جاؤ دفعہ ہو جاؤ! شیر کسی کا انکل نہیں ہوتا۔ زیادہ بک بک کی تو کھال کھینچ کر روسٹ کر لوں گا۔ سنا تم نے جاؤ۔'' شیر کی لال آنکھیں چمکنے لگیں تو سب دُم دبا کر بھاگے کہ اسی میں عافیت تھی۔ بھاگتے بھاگتے سب برگد کی آواز سن کر ٹھہر گئے کیوں کہ برگد کہہ رہا تھا کہ آؤ دوستو! میری مہربان شاخوں تلے پناہ لو۔ میں صدیوں سے یہاں سائے کیے کھڑا ہوں۔ کڑی دھوپ

کڑے موسم میں ہر کوئی یہیں سے گزرتا ہے تو پھر تم لوگ کیوں نہیں آؤ گے دوستو خوش آمدید۔ سب بہت خوش ہوئے اور برگد تلے آ گئے۔ بوڑھا برگد انہیں اپنے کمال سنانے لگا کہ میں صدیوں پہلے جب ننھا سا کم زور درخت تھا تب سوچا کرتا تھا کہ میری چھاؤں کبھی تو گھنی ہو گی جس کی چھایا تلے گرمی کے مارے لوگ، مسافر اور جنگل کے جانور پناہ لیا کریں گے۔ میرے پتوں نے سورج کی تپش کو اپنے اندر اتنا جذب کیا ہے کہ کیا بیان کروں مگر سورج کی گرمی نے میرے اندر گرمی نہیں کی۔ مجھے میرے خالق نے اتنا گھنا بنا دیا ہے کہ آج تم لوگ بھی بارش کی شدت سے بچ کر یہاں میری مہربان پناہوں میں ہو اور یہی میری خوشی کا راز ہے۔ میں دوسروں کو خوش رکھنے میں ہی خوش ہوں۔ میرا یہ پیغام تم لوگوں کو بھی جگہ جگہ پہنچانا ہے کہ اپنی ذات کی بجائے دوسروں کی ذات کو اہم جانو۔ یہی سچی خوشی ہے۔

کہانی سنتے سنتے سب سو گئے۔ زوزی تو زور زور کے خراٹے لیے چلے جا رہا تھا کیوں کہ آج اس کی زندگی کا سب سے لمبا سفر جاری تھا اور چلنے سے تھکاوٹ اتنی بڑھ گئی تھی کہ بوڑھے برگد کی کہانی لوری کی طرح اسے تھپکتے تھپکتے نیند کی گہری وادیوں میں لے گئی تھی۔ کوئی بطخ، کوئی بطا اِدھر اُدھر۔ جہاں جگہ ملی گرے پڑے تھے۔ بارش برس رہی تھی، برگد بہت خوش تھا کہ اتنے جان دار مسافر اس کے مہمان تھے۔ شام ڈھلنے والی تھی، سورج غروب ہونے کو تھا۔ بادلوں اور بارش نے اگرچہ اس کی روشنی پہ پہرے لگا رکھے تھے مگر شام کا ملگجا ملگجا اندھیرا ہوا چاہتا تھا۔ اچانک بجلی کی کڑ کڑ سے سب کی آنکھ کھل گئی۔ برگد بولا کہ ڈرو مت دوستو یہ تو خالق کی بنائی ہوئی ہے۔ خیر ہو۔ سب بولے (آمین)۔ ایسا کرو آج رات یہیں رک جاؤ۔ میری لمبی لمبی جڑ نما شاخیں تمہارے گرد دیواریں بنا کر تمہیں جنگلی درندوں سے محفوظ رکھیں گی۔ صبح تڑکے تڑکے تم اپنے گھروں کو لوٹ جانا۔ آج رات ہم مزے مزے کی باتیں کریں گے اور جب تم سو جاؤ گے تو میں تمہارا دھیان رکھوں گا۔ پیارے دوستو۔ سب نے مل کر یہاں رات گزاری۔ بارش تھم چکی تھی۔ سورج کی پہلی کرن نے انہیں جگایا اور سب نے برگد کو خوب خوب دعائیں دیں۔ یوں زوزی نے جنگل کی سیر کا مزہ لیا اور پھر سے آنے کے وعدے کے ساتھ لوٹ گیا۔ ☆☆☆

بقیہ: ابن بطوطہ

اور سلطان محمد تغلق کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان نے اس کی قابلیت کی بناء پر اسے قاضی کے منصب پر فائز کر دیا۔ اس طرح سے اسے سارے برصغیر کی سیاحت کا موقع ملا۔ ابن بطوطہ، محمد تغلق کے علم و فضل کا بڑا مداح تھا۔

وہ کچھ دیر تک سلطان محمد تغلق کے دربار میں رہا۔ پھر سلطان محمد تغلق نے اسے چین کی سفارت کے لیے نامزد کیا۔

ابن بطوطہ طویل راستے سے چین روانہ ہوا۔ سمندری راستے سے مغربی گھاٹ کے ساتھ گوا کی طرف گیا اور وہاں سے مالدیپ کے راستے جزیرے میں پہنچا۔ وہ ڈیڑھ برس تک وہاں مقیم رہا۔ اس کے بعد سری لنکا روانہ ہوا۔ پھر سمندر کے راستے چین پہنچا۔ کئی دفعہ اس کا جہاز تباہ ہوا وہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹا۔ لیکن اس کے عزم میں کمی نہ آئی۔ آخر کار اس کا بے پناہ شوق 1341ء میں اسے سلامتی سے چین کے ساحل پر لے گیا۔ پانچ برس تک چین میں قیام کیا۔ اس کے بعد ابن بطوطہ وطن روانہ ہوا۔ گھر پہنچنے سے پہلے راستے میں پھر ایک بار حج ادا کیا۔ اپنے وطن میں نئے لوگوں کے قصے کہانیاں سن کر افریقہ کے مغربی ساحلوں کی سیاحت کے لیے روانہ ہوا اور صحرائے افریقہ (اعظم) پار کرتا ہوا ٹمبکٹو پہنچا۔ یہ ابن بطوطہ کا آخری سفر تھا۔

کسی نے ابن بطوطہ سے پوچھا۔ ''تم سفر کرتے ہوئے تھکتے نہیں اور اس مسافت سے تمہیں کیا حاصل ہوا جب کہ تم اطمینان سے اور سکون سے اپنے وطن میں رہ سکتے تھے!''

ابن بطوطہ نے ہنس کر کہا:

''جہاں تک ممکن ہوا، میں نے اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی خوب صورت دنیا کا مشاہدہ کیا۔ میں نے اپنے شوق کی تسکین کر لی ہے۔ میرے اس جواب کو وہی سمجھ سکتا ہے جسے میری طرح دنیا دیکھنے کی دھن، لگن اور اشتیاق ہو۔'' ابن بطوطہ نے واپسی پر اپنا سفر نامہ بھی لکھا تھا۔ یہ سفر نامہ ابن بطوطہ کی آپ بیتی ہے اور ایک تاریخی دستاویز بھی۔ اس میں برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہے۔ اس سفر نامہ کی بدولت ابن بطوطہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 / جون 2017ء ہے۔
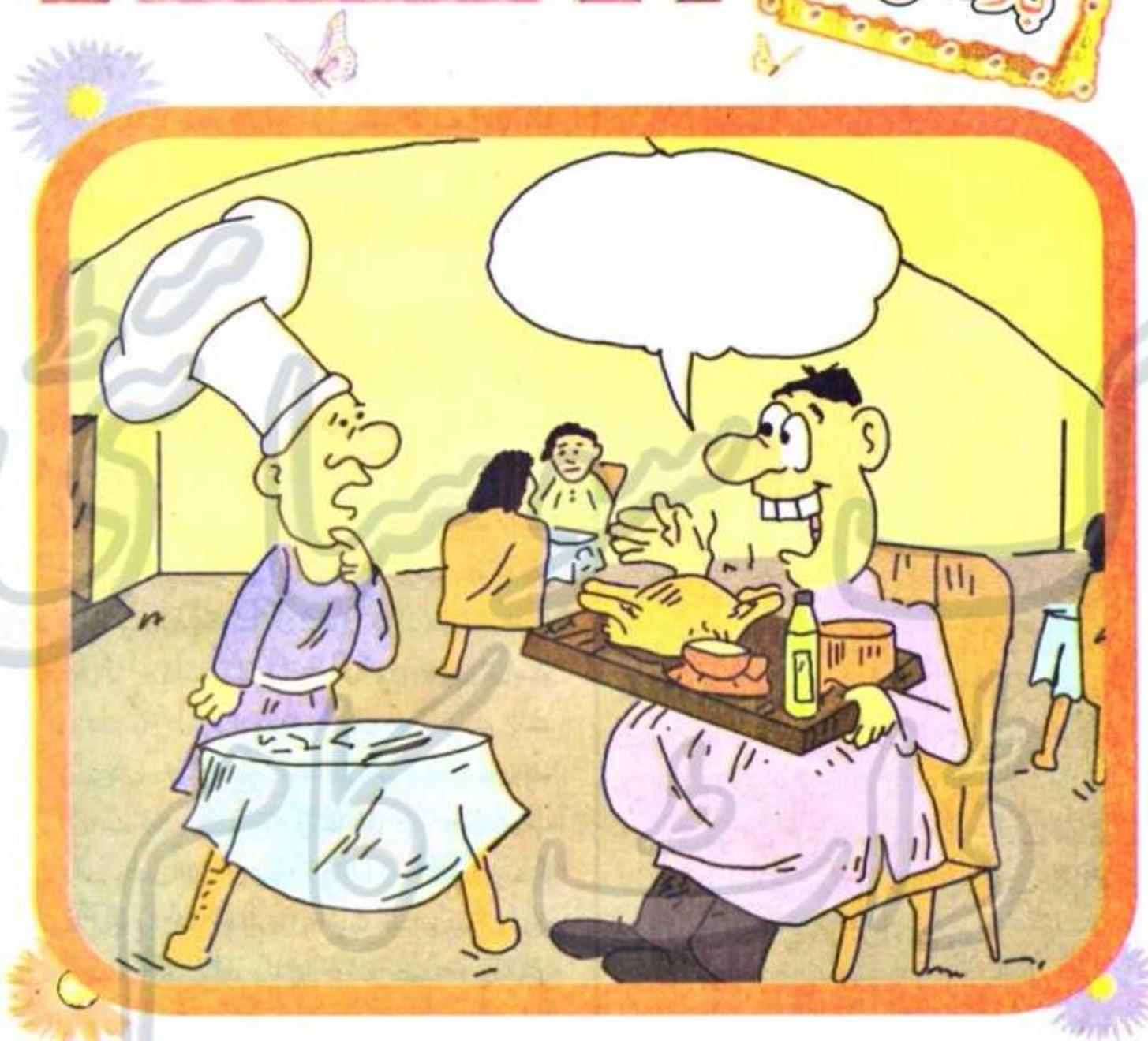
مئی 2017ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی **500** روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- کدھر جاتے ہو صاحب ذرا ادھر بھی دیکھ لو (محمد شاس حسین، بہاول پور)
  اپنی بات تو کر چکے اب میری بھی سن لو
- خاموش مجھ کو دیکھ کر چلا رہے تھے وہ، دیکھ کر زبان میری گھبرا کے چل دیے (علینا اختر، کراچی)
- منہ ہے یا غار ہے عجب بیمار ہے (محمد حذیفہ عثمان، کامرہ)
- ہم کو فریاد کرنی آتی ہے، آپ سنتے نہیں تو کیا کیجیے (محمد عمر اشرف آرائیں، کبیر والا)
- دیکھتے ہی دیکھتے کیسے بدل جاتے ہیں لوگ (انوشہ فاطمہ، لاہور)
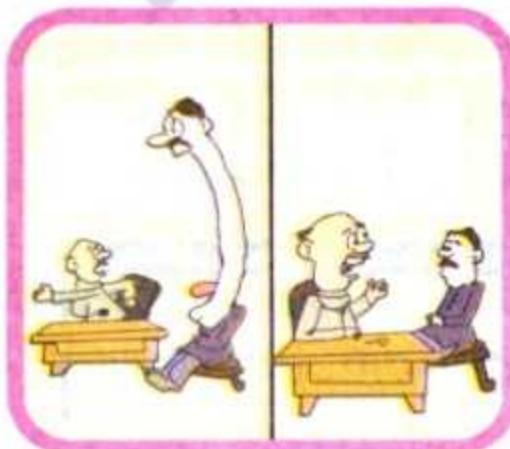
محمد شافع راشد، سیال کوٹ (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

اُسوہ بلوچ، اسلام آباد (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

محب عامر، اسلام آباد (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

مریم ثاقب، روال پنڈی (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

آمنہ تبسم، رحیم یار خان (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: عائشہ خان، مریم حمید، اریبہ فاطمہ، رمشاء شبیر، سوہا فاطمہ، رحیم یار خان۔ بشریٰ حسینی، خنساء حسینی، کلور کوٹ۔ علیشہ سلیمان، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ربیعہ آفتاب، ایبٹ آباد۔ مائرہ شاہد، ماہ رخ صفی، سیدہ زہرہ فاطمہ، عیشہ الرافیہ، ارمش مبشر، لاہور۔ جنت فاطمہ، راول پنڈی۔ اقراء قدیر، تانیا غفور، اسماء بی بی، محمد نعمان طارق، مریم مجید، آمنہ وحید، آفرین اختر، اسلام آباد۔ عاقب فرید گھلو، ہزاری۔ طیبہ ملک ذوالفقار علی، محمد حارث، گوجرانوالہ۔ محمد عادل آصف، چونیاں۔ صبغہ نور، وزیر آباد۔ شاندانہ یار محمد، ایمن یار محمد، تنگی چارسدہ۔ عائشہ عزیز، بادیہ خالق، شاہد علی خان، ڈیرہ غازی خان۔ حسنین علی، حسن ابدال۔ صوفیہ انوار، ردا فاطمہ، محمد زبیر علی، سرگودھا۔ امینہ وحید، واہ کینٹ۔ محمد عفان ربعہ، گجرات۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ محمد ابراہیم، واہ کینٹ۔ نادیہ رفیق، میاں چنوں۔

جون کا موضوع
عید کا دن

آخری تاریخ 8 جون

جولائی کا موضوع
موسم برسات

آخری تاریخ 8 جولائی

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY